۲۲

اسلام کا دستوری قانون

شریعۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

سلسلہ مطالعہ اسلامی قانون (۲۲)

اسلام کا دستوری قانون

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ☆ اسلام آباد

اسلام کا دستوری قانون

تالیف: ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

راہ نمائی: ڈاکٹر محمود احمد غازی

ادارت: شہزاد اقبال شام

نگران شعبہ مطالعہ اسلامی قانون: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں

نگران منشورات: ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین

ناشر: شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

طابع: اظہار پرنٹرز۔۹، ریٹی گن روڈ لاہور

طباعت: اوّل: ۱۹۹۳ء ، دوم: ۱۹۹۶ء ، سوم: ۲۰۰۲ء

چہارم: ۲۰۰۳ء ، پنجم: ۲۰۰۶ء

قیمت: ۳۰ روپے

فہرست مضامین

۱۔ اسلامی ریاست میں حاکمیت اعلیٰ کا تصور	۱
۲۔ مملکت اسلامیہ کے دستور کی اساس	۳
۳۔ رسول اللہ ﷺ کا مقام	۵
۴۔ خلافت کا تصور	۷
۵۔ اصول مشاورت	۹
۶۔ طرز حکومت	۱۱
۷۔ مقننہ	۱۲
۸۔ عدلیہ	۱۴
۹۔ عدلیہ کا مقام	۱۶
۱۰۔ اسلامی دستور میں صوبائی خود مختاری کا تصور	۱۷
۱۱۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں اختیارات	۱۸
۱۲۔ اسلامی ریاست میں شہریوں کے بنیادی حقوق	۱۹
(۱) دین کا تحفظ	۱۹
(۲) جان و آبرو کا تحفظ	۱۹
(۳) مال کا تحفظ	۱۹
(۴) عقلی و ذہنی صلاحیتوں کا تحفظ	۲۰
(۵) حفاظت نسل	۲۰
۱۳۔ شہریوں کے فرائض	۲۲
(۱) سمع و طاعت	۲۳
(۲) خیر خواہی	۲۴
(۳) تعاون	۲۵
(۴) جان کی قربانی	۲۵
(۵) مال کی قربانی	۲۵

۱۴۔ اسلامی مملکت اور غیر مسلم رعایا ۲۶
(۱) جان کی حفاظت ۲۷
(۲) مال کی حفاظت ۲۷
(۳) زرعی زمین کا تحفظ ۲۷
(۴) فوج داری قانون ۲۷
(۵) دیوانی قانون ۲۷
(۶) مذہبی آزادی ۲۸
(۷) روزگار و معاش کا ذمہ ۲۸
(۸) اہل ذمہ کا دفاع ۲۸
۱۵۔ اسلامی ریاست یا لادینی ریاست ۲۹
۱۶۔ مزید مطالعہ کے لیے ۳۲
۱۶۔ حواشی و حوالہ جات ۳۳
۱۷۔ مصادر و مراجع ۳۴

ابتدائیہ

مطالعہ اسلامی قانون کورس کے اجراء کے وقت ہمارے پاس صرف انیس اسباق تیار تھے۔ اللہ کا نام لے کر ہم نے کورس شروع کر دیا۔ خیال تھا کہ باقی پانچ اسباق سال کے اندر اندر تیار ہو جائیں گے مگر جب عملاً کورس شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کام کے لیے مکمل ذہنی ارتکاز درکار ہے۔ ادھر کورس شروع ہوتے ہی کام کا دباؤ اچانک بڑھ گیا جس کے باعث خود میرے لیے یہ کام جاری رکھنا ممکن نہ رہا۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہم نے دوسرے اہل علم سے گزارش کی کہ وہ ہمیں اس مشکل سے نکالیں۔ جناب ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ بہاولپور یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ میں عرصہ دراز سے پروفیسر کی حیثیت سے تحقیق و تدریس میں مشغول ہیں۔ انہوں نے ازراہ شفقت ہماری درخواست نہ صرف قبول کی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عید کی چھٹیوں میں بھی انہوں نے اس کام کو اولیت دی اور بالآخر زیر نظر یونٹ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

امید ہے کہ کورس کے شرکاء تحریر کے اس تنوع پسند کریں گے۔

شہزاد اقبال شام
نگران مطالعہ اسلامی قانون کورس

۳۰ جون ۱۹۹۵ء

پیش لفظ

اسلام کی طویل فکری اور عملی تاریخ میں مسلم اہل علم و دانش کو گوناگوں چیلنجوں اور مبارزتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دور تابعین میں وضع حدیث اور قضاء و قدر کے بارہ میں شبہات سے لے کر دور جدید کے مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے استیلاء تک کا یہ سارا زمانہ ایک مسلسل فکری جہاد اور علمی دفاع سے عبارت ہے۔ اس پورے دور میں اہل علم نے نہ صرف حالات زمانہ کو پیش نظر رکھا' بلکہ ہر نئی فکری مبارزت کے جواب میں اکثر و بیشتر انہی ہتھیاروں اور وسائل سے کام لیا جن سے کام لے کر اسلام پر اعتراضات کئے گئے۔ اس کی کامیاب ترین مثال یونانی علوم و فنون سے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ ابتدائی سو' سوا سو سال کے عبوری دور کے بعد بھی مسلمان مفکرین نے یونانی منطق اور فلسفہ سے اسلامی عقائد کی تفسیر و توضیح کی اور اسلامی تعلیمات کی تبیین و تفہیم کا وہ کام لینا شروع کر دیا تھا جس کے عجیب و غریب نمونے امام غزالی' امام رازی' امام شاطبی اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

دور جدید میں اس کام کی اہمیت اور پیچیدگی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ پہلے مبارزت صرف ایک میدان میں تھی' یعنی فلسفہ' منطق اور عقلیات کا میدان۔ اب یہ مبارزت زندگی کے ہر میدان میں ہے۔ فلسفہ اور انسانی علوم سے لے کر روزمرہ زندگی کے مظاہر تک' آج ہر قدم پر دنیائے اسلام کو بیرونی اور خارجی قوتوں سے قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ ان میں سے بعض مقامات میں یہ نبرد آزمائی نسبتاً زیادہ اہم اور فوری نوعیت کی ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ ملت مسلمہ ان معاملات کے بارہ میں فوری طور پر اپنے کو صف آراء کرے اور اپنے وسائل و اسباب کو کماحقہ استعمال کرے۔ ان اہم اور فوری امور میں ایک انتہائی اہم مسئلہ قانونی' دستوری اور عدالتی معاملات کا ہے۔ اس میدان میں مغربی تصورات و افکار کے تسلط اور غلبہ نے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو متاثر بلکہ ماؤف کر دیا ہے کہ یہ طبقہ اسلام کے تصورات و نظریات کو سمجھنے میں اس طرح مشکل محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی بھی مغربی دانشور۔ تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ دنیائے اسلام میں اس صورت حال کے خلاف ایک شدید رد عمل اٹھتا نظر آرہا ہے جو اگر مثبت اور تعمیری خطوط پر آگے بڑھا تو ایک بڑی خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بنے گا۔

اسی رد عمل کا مظہر وہ دلی آرزو ہے جو اسلام کے تصور عدل و احسان پر مبنی معاشرہ کے قیام اور اسلامی تصورات کے عملی نفاذ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں اٹھتی نظر آتی ہے۔ اسی آرزو کی تکمیل کے انتظار میں آج لاکھوں گردنیں کٹ رہی ہیں' لاکھوں گھر اجڑ رہے ہیں' کتنے ہیں جو گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں اور کروڑوں دل ہیں جو اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی تمنا میں دھڑک رہے ہیں۔ لیکن اس خواب کی تعبیر اس قدر آسان نہیں ہے جتنا ہم میں سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر ایک طویل سفر کی متقاضی ہے۔ ایسا طویل سفر جس کی پہلی منزل' ایک فکری تبدیلی' ایک تعلیمی تحریک اور ایک ذہنی

انقلاب سے عبارت ہے - جب تک اسلام کے تصورات و تعلیمات پر گہرا ایمان رکھنے والی' دور جدید میں ان کو روبہ عمل لانے کے جذبہ سے سرشار اور اس راہ کی مشکلات سے کلی طور پر آگاہی اور ادراک رکھنے والی نسل وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک اس خواب کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اس پہلی منزل کا پہلا قدم اسلامی فقہ اور قانون کی کماحقہ تعلیم و تدریس اور اس سلسلہ میں ضروری مردان کار کی تیاری کا کام ہے۔ ایسے مردان کار جو اسلامی فقہ کو اس کے بنیادی ماخذ و مصادر سے براہ راست سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں' جن کو رائج الوقت قانونی' دستوری' اور عدالتی تصورات سے گہری لیکن ناقدانہ واقفیت حاصل ہو' جو شریعت کی حقانیت اور صلاحیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور دور جدید میں اس کی تعلیمات کو روبہ عمل لانے کا مومنانہ جذبہ رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کی تیاری وقت کی وہ اہم ضرورت ہے جس کو ہماری ملی ترجیحات میں ابھی تک وہ جگہ حاصل نہیں ہوئی جو اس کو ہونی چاہیے تھی۔

بلاشبہ ہمارے بہت سے دینی اداروں اوراسلامی تعلیم کے مراکزمیں فقہ کی تدریس و تحقیق کا کام ہو رہا ہے اور فقہی موضوعات پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ سب کچھ قطعاً" ناکافی ہے۔ اس تعلیم و تحقیق کاہمارے قانونی نظام اور دستوری اداروں پر اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ملک میں نفاذاسلام کے کام میں پیش رفت نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم کی گئی۔ اکیڈمی نے وکلاء اور ارکان عدلیہ کے تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر جدید انداز سے اسلامی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کی اشاعت کے ایک طویل المیعاد منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ تصنیف و تحقیق اور نشرو اشاعت کے اس طویل منصوبہ کے ساتھ ساتھ اکیڈمی نے آج سے چند سال قبل ایک شعبہ ایسا بھی قائم کیا جہاں فاصلاتی تعلیم کے اصولوں کے تحت فقہ اسلامی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ متواضعانہ پیش کش مقبول ہوئی اور اللہ رب العزت نے اپنی بے پایاں نعمت اور لامتناہی فضل سے ہماری اس کاوش کو کامیابی سے نوازا اور ہم تین سال کی مختصرمدت میں اس کورس کے ذریعہ پاکستان اور بیرون پاکستان کے کوئی ڈیڑھ ہزار افراد تک اسلامی قانون اور فقہ کی ایک مربوط اور جامع تصویر پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

زیر نظر کورس وکلاء ' طلبہ قانون اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ہے۔ اس کا دورانیہ ایک سال ہے اور یہ چوبیس اسباق یا یونٹوں پر مشتمل ہے جن میں فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ہر سبق میں تدریسی مواد کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مطالعہ قانون اسلامی کے اس ابتدائی کورس کے بعد چار دوسرے کورس بھی تیار کرائے جارہے ہیں جو فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ہمارے ان "ایڈوانس کورسز" کی تیاری کا کام جاری ہے اور جلد ہی ہم ان کو بھی شروع کر دیں گے۔

کچھ اس یونٹ کے بارہ میں

ریاستی ترتیب و تنظیم سے متعلقہ نظری مباحث پر مواد اگرچہ کتب فقہ کے بجائے کتب علم الکلام میں سب سے زیادہ ملتا ہے اور یہ مباحث فقہ کے اساسی موضوعات میں شامل نہیں ہیں تاہم انہیں اسلام کے مجموعی سیاسی و قانونی نظام سے بالکلیہ الگ بھی نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ فقہائے کرام کے کام کا معتدبہ حصہ اسلامی ریاست کے فرائض اور ذمہ داریوں سے بحث کرتا ہے' اس موضوع کی انفرادیت کی وجہ سے فقہاء نے اس سے جداگانہ طور پر بحثیں کی ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر الگ سے کتابیں لکھی ہیں۔ یہ موضوع ہمہ جہت ہے اور ان مختصر صفحات میں اس سے انصاف کرنا ممکن نہیں اس لیے قارئین کو بعض اہم مباحث پر بنیادی معلومات مہیا کر کے مزید مطالعہ کے لیے کچھ مفید کتب کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس یونٹ میں اسلامی ریاست کے دستوری موضوعات کا جائزہ عہد حاضر کی زبان اور اسلوب میں لیا گیا ہے۔ تاریخ انسانی میں جب حکومت اور ریاست کی ماہیئت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تو اس کے اساسی مباحث و موضوعات میں تبدل کیونکر ممکن ہے۔

اس یونٹ کی ابتدا میں حاکمیت اعلیٰ کا تصور پیش کرنے کے بعد اسلامی ریاست کے دستور کی بنیادوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسالت کا مقام واضح کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ یہ اسلامی دستور حیات کی اساسی بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد ہے۔ اصول مشاورت اسلامی نظام حکومت کا مغز ہے جس پر یونٹ کے آغاز ہی میں گفتگو کی گئی ہے۔ یونٹ کے اگلے حصے میں اسلامی ریاست کے شہریوں کے بنیادی حقوق اور فرائض کا تذکرہ شامل ہے۔ اقلیتیں بھی کسی اسلامی ریاست کا ایک جزو لاینفک ہو سکتی ہے۔ عہد حاضر میں تو اقلیتوں کے مسائل نے ایک مستقل مبحث کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس لیے یہ عنوان بھی یونٹ کا ایک اہم حصہ ہے۔ آخری حصے میں کسی اسلامی ریاست اور لادینی ریاست میں پائے جانے والے فرق کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے اس اختتامی عشرے میں گزشتہ پچاس ساٹھ سالوں کی فکری کوششوں کے باوجود یہ کہنا ازحد دشوار ہے کہ دنیا کے کسی ملک کو مثالی اسلامی ریاست قرار دیا جائے لیکن اس حقیقت کو بھی جھٹلانا آسان نہیں ہے کہ جس فکری راستہ پر پانچ چھ عشرے قبل امت مسلمہ نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا قافلہ اس پر بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ کئی نشان راہ' غبار راہ کی نذر ہو چکے ہیں' اور دانا بینا راہ رو منزل کو نشان منزل واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے' لیکن منزل کی قربت اور آبلہ پائی اگر مسافر میں تساہل یا کم ہمتی پیدا کر دے تو صدیوں کے گم ہونے میں محض ایک لمحے کی غفلت کافی ہوتی ہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودمی صد سالہ راہم دور شد

امت مسلمہ کے سوجھ بوجھ رکھنے والے اصحاب سے گزارش ہے کہ ان موضوعات پر ہماری راہنمائی کریں تاکہ امت مسلمہ ماضی کی یہ متاع گشتہ منزل مراد کی شکل میں دوبارہ حاصل کر سکے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری ان کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین

۶ جمادی الاخر ۱۴۱۸ھ

۹ اکتوبر ۱۹۹۷ء

ڈاکٹر محمود احمد غازی

ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

حصہ اول

اسلام کا دستوری قانون

اسلامی ریاست میں حاکمیت اعلیٰ کا تصور

اسلامی ریاست وہ مملکت ہے جسے امت مسلمہ کے افراد اپنے دین کے قیام، ملی روایات کے تحفظ اور اجتماعی امور کی نگہبانی کے لیے قائم کرتے ہیں۔ ان میں دین ہر چیز پر مقدم ہے اس لیے کہ اسلامی معاشرہ دین کی بنیاد پر ہی وجود میں آتا ہے، پھر یہ معاشرہ دین کے قیام کے لیے مملکت کی تشکیل کرتا ہے۔ اس طرح دین اصل ہے اور مملکت اس کے قیام کا ذریعہ ہے۔ دین میں چار چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔ عقائد

عقائد جو فکری اصلاح کا بنیادی ذریعہ ہیں اور عملی زندگی کو بھی صحیح راہ پر گامزن رکھتے ہیں، اس طرح عقائد ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کا اہم ذریعہ ہیں۔

۲۔ عبادات

عبادات جو عبد اور معبود کے تعلق کو قائم و مستحکم رکھتی ہیں اور فکری زندگی کا عملی اظہار ہیں۔

۳۔ اخلاقی اقدار

مکارم اخلاق جو باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھتے ہیں اور معاشرہ کو پرامن و پر سکون بناتے ہیں۔

۴۔ احکام

عملی زندگی سے متعلق واضح ہدایات جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہل ایمان کو دی گئی ہیں، ان پر عمل پیرا ہو کر انسان ایک طرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرتا ہے تو دوسری طرف یہی احکام انسانوں کو حلال و حرام، جائز و ناجائز اور حقوق و فرائض کا تعین کر کے باہمی تعلقات کو عدل و انصاف کی بنیاد پر مزید مستحکم کرتے ہیں۔

اسلامی مملکت ان چار بنیادی اصولوں کے تحفظ اور ان کے قیام کے لیے وجود میں آتی ہے۔ عقائد میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل عقیدہ توحید ہے۔ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اس کے لیے مخصوص حقوق کی وضاحت کرتا ہے۔ اسلامی مملکت کی تمام تہذیبی اور تمدنی بنیادیں اسلامی عقائد بالخصوص عقیدہ توحید پر مبنی ہوتی ہیں۔ ایسا کوئی تصور یا عمل، جس سے اسلام کے بنیادی عقائد خصوصاً عقیدہ توحید پر زد پڑتی ہو، اسلامی مملکت میں قابل قبول نہیں۔

اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی اس کے سارے نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہ چاند سورج کی گردش، موسموں کے تغیرات، دن اور رات کی آمد و رفت، شجرو حجر سب حکم خداوندی کے تابع ہیں۔ اس حاکمیت مطلقہ کو قرآن حکیم اس طرح بیان کرتا ہے۔

لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ (مائدہ، ۵ - ۱۷)

زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اللہ ہی کی ملکیت ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا۔ (کھف، ۱۸: ۲۶)

اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ۔ (الاسرا، ۱۷: ۱۱۱)

ملک (حکمرانی) میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

سورہ انعام کی ابتدائی تین آیات میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ زمین و آسمان کی تخلیق، روشنی و تاریکی، انسان کی اپنی اصلیت و پیدائش، پھر ایک مقررہ وقت تک زندگی کے مختلف مراحل سے گزر کر موت کی آغوش میں جانا، یہ سب اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ سورہ نمل کی آیات ۶۰ تا ۶۶ میں بہت ہی بلیغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت و عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات کے مطالعہ سے قاری کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے مطلق اقتدار کا علم قطعی و یقینی طور پر ہو جاتا ہے۔

امت مسلمہ دین کے تحفظ اور اس کے قیام کے لیے اجتماعی طور پر جدوجہد کرتی ہے۔ لہٰذا دین کے چاروں عناصر اسلامی مملکت میں غالب عنصر کے طور پر موجود رہیں گے۔ کوئی فرد یا ادارہ ان کی حیثیت کو بدل سکتا ہے نہ نظر انداز کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم حاکمیت اعلیٰ کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، اس کا عظیم تر اقتدار اور اس کی حاکمیت مطلقہ مراد ہوتی ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

حاکمیت اعلیٰ کے بارے میں ہماری اس رائے کی مزید وضاحت نظم خلافت پر غور و فکر سے بھی ہو جاتی ہے۔ اسلامی معاشرہ جس نظم مملکت یا سیاسی نظام کی تخلیق کرتا ہے وہ نظام خلافت ہے عبدیت کا احساس ہر انسان میں فطرتاً موجود ہوتا ہے۔ ہر انسان کا وجدان اس کائنات میں کارفرما تکوینی و طبعی قوانین کے سامنے بے بسی کی شہادت دیتا ہے۔ ان قوانین کے پس پردہ صرف ایک ذات کار فرما نظر آتی ہے جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی باگ ڈور ہے، وہی قادر مطلق ہے۔ اس ہستی کے سامنے انسان سرنگوں ہو جاتا ہے اور اپنی بندگی (عبدیت) کا اعتراف کرتا ہے۔ عبدیت کا اجتماعی شعور اور معبود حقیقی کے سامنے مکمل تسلیم و رضا مسلم معاشرہ میں ایک خاص تہذیب و تمدن کو جنم دیتا ہے، وہ تہذیب جس میں ایک طرف تعلق مع اللہ مستحکم ہوتا ہے اور انسان حقوق اللہ کی

حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے تو دوسری طرف حقوق العباد کی نگرانی کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ ان تمام فرائض کی انجام دہی میں انسان رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا مقدس اور اہم فریضہ انجام دے رہا ہوتا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی جس نظم و نسق کے تحت ہوتی ہے وہ نظم خلافت کہلاتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے معاشرہ میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ ایک مسلمہ حقیقت ہوتی ہے جس سے انحراف ممکن نہیں۔

عقائد اور خصوصاً توحید کے مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت، وسعت اور اقتدار کا جو تصور ابھرتا ہے وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے اور سیاسی اقتدار اعلیٰ (Political Sovereignty) ایک علیحدہ موضوع ہے۔ پہلے کا تعلق عقیدہ و ایمان سے ہے جب کہ دوسرے کا تعلق انتظام مملکت اور دستور سے ہے۔ سیاسی اقتدار اعلیٰ کا مفہوم کسی معاشرہ کی اپنی تہذیبی، تمدنی اور سیاسی روایات کے سیاق وسباق میں متعین ہوتا ہے جو بہت محدود بھی ہوتا ہے اور دستوری حدود کے اندر حاصل ہوتا ہے۔ سیاسی اقتدار اعلیٰ کا تعلق انتظامی امور سے ہے، اس کا ایمان و عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں، حالات و ضروریات کے تحت اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا سیاسی اقتدار اعلیٰ کے مسئلہ کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں بالکل علیحدہ مسئلے ہیں۔

مملکت اسلامیہ کے دستور کی اساس

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ دین اسلام کو مملکت پر فوقیت حاصل ہے، مملکت کے قیام کا اصل مقصد دین کا قیام ہے۔ مملکت اسلامیہ اس لیے وجود میں آتی ہے کہ اہل ایمان اپنے دین و عقیدہ کے مطابق اجتماعی زندگی بسر کر سکیں، اسلام کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ اس کے حکم پر پوری رضا اور رغبت کے ساتھ عمل پیرا ہو۔ لہٰذا اطاعت الٰہی ہر چیز پر مقدم ہے اور اسے دستوری بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے لیے اسلامی ادب میں عبادت کی جامع اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بطیب خاطر قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہونا اور اس کے ذریعے قرب الٰہی حاصل کرنا عبادت ہے۔ یہ تقرب جہاں ارکان خمسہ سے حاصل ہوتا ہے وہاں اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنے سے بھی ہوتا ہے اسی طرح تمام اوامر پر عمل درآمد اور تمام نواہی سے اجتناب بھی قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ یہ سب کچھ عبادات کے دائرے میں آتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ (ذاریات، ۵۱:۵۶)

اور میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ (بقرہ، ۲:۲۱)

اے لوگو! اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی

بن جاؤ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء، ۲۱: ۲۵)

اور ہم نے جو رسول بھی آپ ﷺ سے قبل بھیجا اس پر یہی وحی نازل کی تھی کہ میرے سوا کوئی الہ نہیں ہے لہٰذا میری عبادت کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (آل عمران، ۳: ۵۱)

یقیناً اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا رب ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں داخل ہیں، مکمل اطاعت اور انتہائی عاجزی و انکساری، ابن منظور نے عبادت کے لغوی معنی یہ بیان کیے ہیں: الطاعة مع الخضوع "وہ اطاعت جو خضوع و خشوع کے ساتھ ہو"۔ امام راغب اسے غاية التذلل کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی تذلل اور عاجزی عبادت کہلاتی ہے۔ گو دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور ظاہر و باطن ہر لحاظ سے جھک جانا، اس کے حکم کو قلب و دماغ کی گہرائی کے ساتھ قبول کرنا اور اپنی عبدیت کے احساس اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے شعور کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونا عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کس طرح کی جائے۔ اس کے احکام کا علم ہمیں کیسے حاصل ہو، کن باتوں سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور کون سی چیزیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ سے بعد اور اس کی ناراضگی کا سبب بنتی ہیں۔ ان سب باتوں کو جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب نازل فرمائی۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (انعام، ۶: ۱۵۵)

اور یہ بابرکت کتاب ہم نے نازل کی ہے لہٰذا اس کی پیروی کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (ابراہیم، ۱۴: ۱)

یہ کتاب ہم نے آپ پر نازل کی تاکہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں ان کے رب کے حکم سے، ایسے راستہ کی طرف جو غالب اور قابل تعریف ہے۔

وبالحق انزلنه و بالحق نزل۔ (اسراء، ۱۷: ۱۰۵)

اور ہم نے اس کو حق کے ساتھ نازل کیا اور حق صداقت کے ساتھ ہی وہ نازل ہوا۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص، ۳۸: ۲۹)

یہ کتاب جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے بابرکت کتاب ہے' تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں اور اور صاحب عقل و بصیرت نصیحت حاصل کریں۔

یہ کتاب وحی الٰہی ہے جس کا ہر لفظ منزل من اللہ ہے جس کی حقانیت و صداقت پر امت مسلمہ کا غیر متزلزل ایمان ہے اور جس کے منجانب اللہ ہونے پر امت کا اجماع ہے اور جو کتاب عہد رسالت سے آج تک اس طرح محفوظ چلی آرہی ہے کہ ان چودہ صدیوں میں ایک دن' ایک گھنٹہ یا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جس میں یہ کتاب تحریری (صحف کی) شکل میں نہ رہی ہو۔ اس طرح ان چودہ صدیوں میں ایک دن ایک گھنٹہ یا ایک لمحہ ایسا بھی نہیں گزرا جس میں قرآن حکیم حفاظ کے سینوں میں محفوظ نہ رہا ہو۔ دنیا میں کوئی اور کتاب ایسی نہیں ہے جسے اس قدر اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہو۔ لہٰذا یہ مکمل کتاب ایک ایسا دستور ہے جسے امت ایمان کے لازمی حصہ کے طور پر قبول کرتی ہے۔ بلکہ وہی لوگ امت مسلمہ کے افراد شمار ہوتے ہیں جو کتاب اللہ کے جملہ احکام و ہدایات پر اس کی روح اور الفاظ کے مطابق عمل کرنا واجب اور ان کی خلاف ورزی کرنے کو ظلم و فسق اور کفر کے مترادف گردانتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا مقام

اسلامی معاشرہ میں انبیاء علیہم السلام کو اس لحاظ سے بہت نمایاں مقام حاصل ہوتا ہے کہ ان پر ایمان لانا فرض ہوتا ہے۔ وہ انسانیت کے لیے سرچشمہ ہدایت ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد انسانوں کی ہدایت و رہنمائی ہوتا ہے' اسی لیے ان کی اپنی زندگی بھی ایک مثالی نمونہ ہوتی ہے۔ آخری رسول حضرت محمد ﷺ کے بارے میں قرآن حکیم نے صاف طور پر کہا ہے۔ کہ آپؐ اخلاق کے بلند ترین درجہ پر فائز ہیں اور یہ کہ آپ کی زندگی کا ہر پہلو ہر جہت اور ہر لحاظ سے ایک بہترین نمونہ ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات ہمارے ایمان کا حصہ ہے' کوئی فرد ملت اسلامیہ کا رکن شمار نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لے آئے۔

قرآن حکیم میں جب اللہ تعالیٰ پر ایمان کا ذکر آتا ہے تو زور عبادت و تسلیم پر ہوتا ہے لیکن جب رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا ذکر آتا ہے تو ارتکاز اطاعت و اتباع پر ہوتا ہے' حتیٰ کہ اللہ کی اطاعت بھی اطاعت رسول پر منحصر ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء' ۴: ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اسی نے حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

اطاعت رسول ہی ایمان کا پیمانہ ہے اگر جذبہ اطاعت نہ ہو تو دوسرے تمام اعمال بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (محمد' ۴۷: ۳۳)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔

یہ جذبہ اطاعت کسی ظاہری جبر و قوت کی بنا پر نہیں ابھرتا بلکہ قوت ایمانی اور شوق و محبت سے اطاعت کا عمل شروع ہوتا ہے اور انسان پورے اطمینان قلب' اخلاص و محبت اور جذبہ احترام کے ساتھ سرگرم عمل ہوتا ہے۔ ادب و احترام ملحوظ نہ ہو تو اعمال کے ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ رسول ﷺ کے ساتھ برتاؤ اور معاملہ اس طرح کا نہیں ہو سکتا جس طرح ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ رسول کا مقام اس سے بہت بلند ہے۔ اس بلند مقام اور عظمت رسول کو پوری طرح ملحوظ رکھنا ضروری ہے ورنہ اس بات کا خدشہ ہے کہ

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (حجرات' ۴۹:۲)

کہیں ایسا نہ ہو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور و احساس نہ ہو۔

رسول پر ایمان مقام رسول کا تعین کرتا ہے۔ جب کوئی فرد محمد ﷺ کو رسول مانتا ہے اور اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اس کی دنیا و آخرت کی فلاح وسعادت کا دارومدار اس پیغام کو ماننے اور اس پر عمل کرنے میں ہے جو اللہ کے رسول نے انسانوں تک پہنچایا ہے تو اس سے خود بخود رسول کا مقام متعین ہو جاتا ہے۔ یقینی بات ہے کہ رسول پر ایمان رکھنے والا فرد دنیا و مافیھا کی ہر چیز پر رسول کو فوقیت دے گا' ایمان کا یہ ایک منطقی نتیجہ ہے اور یہی ایمان کا لازمی تقاضہ بھی ہے۔ قرآن کریم نے بالکل اس فلسفہ کے مطابق حکم دیا ہے کہ سنت رسول اللہ ﷺ مسلم معاشرہ میں واجب العمل ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے رسول ﷺ شارح قرآن ہیں۔ آپؐ امت کے مربی و معلم ہیں۔ آپ کی حیثیت حاکم اور قاضی کی بھی ہے لہٰذا آپؐ کے فیصلوں اور آپ کے دیئے ہوئے قاعدے وضابطے اور احکام پر عمل واجب ہے۔

سنت کی مذکورہ آئینی اور دستوری حیثیت کے بارے میں صرف قرآن حکیم کی واضح آیات ہی نہیں بلکہ امت مسلمہ نے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے فوراً بعد اس مسئلہ کو بالاجماع طے کر لیا تھا کہ زندگی کے تمام مسائل میں قرآن و سنت ہی اصل اور قانونی ماخذ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تقریر میں' جو انہوں نے خلافت پر فائز ہونے کے بعد کی' یہ بات واضح طور پر فرمائی تھی کہ تمام فیصلے قرآن وسنت کی روشنی میں طے ہوں گے۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ اگر میں قرآن و سنت کی پیروی نہ کروں تو لوگوں پر میری اطاعت ضروری نہیں رہے گی۔ گویا آپ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر خلیفہ وقت قرآن و سنت سے انحراف کرے تو اس کی خلافت ہی معطل تصور ہوگی اور بیعت کے ذریعہ لوگوں نے اطاعت کی جو ذمہ داری قبول کر لی ہے وہ کالعدم ہو جائے گی[۱]۔ یہ اعلان صحابہ کرام کی بڑی تعداد کے سامنے کیا گیا' اس میں تمام جلیل القدر انصار و مہاجرین موجود تھے۔ سب ہی نے سنت کی اس آئینی

حیثیت سے اتفاق کیا۔ امت مسلمہ کی پہلی نسل جس نے پورے دین کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں مشاہدہ کر کے محفوظ کیا تھا اور جس نے اس دین کو اگلی نسل تک منتقل کیا تھا۔ اسی نے اس مسئلہ پر پہلا اجماع کر کے سنت کی آئینی حیثیت کو ہمیشہ کے لیے طے کر دیا۔ تمام فقہاء مثلاً امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام جعفر' امام سفیان ثوری' امام اوزاعی' امام شافعی' امام احمد بن حنبل اور دیگر فقہاء اس پر متفق ہیں کہ سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل واجب ہے اور سنت کی موجودگی میں قیاس و اجتہاد کی ضرورت نہیں رہتی' اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ظن و تخمین پر مبنی نہیں ہوتی نہ ہی خواہشات کا کوئی عنصر دینی امور سے متعلق ان کے قول و عمل میں شامل ہوتا ہے۔ وہ تو وحی الٰہی کی روشنی میں رائے قائم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہی ان کا اصل مقصود ہوتا ہے' لہٰذا سنت رسول کو بھی اسلامی مملکت میں آئینی اور دستوری حیثیت حاصل ہے۔

خلافت کا تصور

اسلام کے سیاسی و معاشرتی نظم کے صحیح صحیح مفہوم کو ادا کرنے کے لیے خلافت ہی ایک جامع اصطلاح ہے جس میں امت مسلمہ کی ساری سیاسی و دستوری تاریخ پنہاں ہے اور اسی میں اس کا فلسفہ مضمر ہے۔ یہی وہ اصطلاح ہے جو ہمیں اپنے ورثہ' اپنی تاریخ اور ثقافت سے وابستہ رکھتی ہے۔

خلافت مقاصد نبوت کی بجا آوری میں رسول اللہ ﷺ کی نیابت سے عبارت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث' جسے صحیحین نے نقل کیا ہے' بتاتی ہے کہ رسول ﷺ پر نبوت ختم ہو گئی ہے البتہ نبوت کے مشن کو جاری و قائم رکھنے کے لیے آپؐ کے بعد خلافت کا نظم قائم ہو گا (لانبی بعدی وستکون خلفاء)[۲]۔

انسانیت کی فلاح و سعادت کے لئے جس طرح نبوت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح رشد و اصلاح کے نبوی مشن کو زندہ رکھنے اور انسانیت کو بہیمیت سے بچا کر ملکیت کی راہ پر گامزن رکھنے' ظلم و فساد سے روک کر عدل و احسان قائم کرنے کے لئے اور امت کے اجتماعی نظم کو قائم رکھنے کیلئے خلافت کی ضرورت رہتی ہے۔ اسی ضرورت کے تحت صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کو قائم کیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے موقع پر خلافت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ اے لوگو! محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں' البتہ کسی فرد کو آگے آنا چاہیے جو معاشرہ میں دین کے قیام کی ذمہ داری قبول کرے[۳]۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پہلی تقریر جو انہوں نے عہدہ خلافت سنبھالنے کے بعد مسجد نبوی میں فرمائی' بنیادی دستوری نکات کا شاہکار ہے۔ اس تقریر میں خلیفہ اول نے حکومت کی پالیسی کو واضح کیا' لوگوں کے آئینی حقوق اور ذمہ داریوں کو بہت مختصر مگر جامع الفاظ میں بیان کیا اس تقریر کے اہم نکات یہ ہیں۔

۱۔ خلیفہ امت ہی کا ایک فرد ہے' انہی میں سے منتخب ہوا ہے۔

۲۔ اچھے کاموں میں اس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔
۳۔ خلیفہ غلطی کر بیٹھے تو اس کی اصلاح کی جائے۔
۴۔ سچائی امانت ہے۔
۵۔ جھوٹ خیانت ہے۔
۶۔ حکومت معاشرہ کے کمزور لوگوں کی پشت پناہ ہوگی۔
۷۔ طاقت ور اور دولت مند طبقے کو قانون و اخلاق کی حدود میں پابند رکھا جائے گا۔ اور اسے کمزور پر زیادتی نہیں کرنے دی جائے گی۔
۸۔ جو قوم جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیتی ہے وہ ذلت کا شکار ہو جاتی ہے۔
۹۔ جس قوم میں فحاشی پھیل جاتی ہے وہ مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔
۱۰۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں، تم لوگ میری اطاعت کرو۔
۱۱۔ اگر میں اللہ اور رسول کی اطاعت سے انحراف کروں تو تم پر میری اطاعت ضروری نہیں[۴]۔

ہمارے فقہاء نے خلفاء راشدین کے عملی نمونوں، ان کے فیصلوں اور خطابات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خلافت کے نظم اور ڈھانچہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ خلافت کا مفہوم و منہاج خلافت راشدہ کی روشنی میں بیان کریں مثلاً ماوردی نے خلافت کی تعریف یہ کی ہے۔

الامامۃ موضوعۃ لخلافۃ النبوۃ فی حراسۃ الدین وسیاسۃ الدنیا[۵]

خلافت یا امامت قائم ہی اس لئے ہوتی ہے کہ دین کی حفاظت اور دنیوی امور اور اس کا نظم و نسق چلانے میں رسول ﷺ کی نیابت کا فریضہ انجام دے۔

عبدالقاہر بغدادی اور امام الحرمین جوینی نے بھی اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک بھی خلافت ایک مکمل اور بھرپور قیادت ہے جو دینی امور کی نگرانی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے اور دنیوی امور کی نگرانی کا بھی، گویا خلافت حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی نگرانی اور تحفظ کی ذمہ داری کا نام ہے۔ دونوں کے تحفظ سے ایک ایسی تہذیب کو فروغ دیا جاتا ہے جس کی بنیاد اسلامی عقائد اور اخلاقی اقدار پر ہوتی ہے، جس میں معروف پھلتا پھولتا ہے اور منکر یا برائی کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔

مقاصد خلافت کی عظمت اور اس کی اہمیت کے پیش نظر ہمارے فقہاء نے جب اس موضوع پر بحث کی ہے تو قیادت کی عمومیت اور جامعیت پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ چنانچہ بہت سے فقہاء خلافت کی تعریف کرتے ہوئے ریاست عامہ کے الفاظ کو خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ یعنی خلیفہ کی قیادت و سیادت تمام مملکت پر محیط ہونی

چاہیے۔ لہٰذا کسی علاقہ کا گورنر، قائد یا وزیر جس کی قیادت مخصوص علاقہ تک محدود ہو، خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اس جملہ (ریاستہ عامہ) کے اضافہ سے خلافت اور امارت کا فرق واضح کرنا مقصود ہے۔ غالباً امام الحرمین جوینی پہلے فقیہ ہیں جنہوں نے خلافت میں ریاست عامہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس جملہ کا اضافہ کیا ہے۔ دراصل امام الحرمین نے امت مسلمہ کی اجتماعیت اور وحدت کی اہمیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خلافت اس وحدت کا تحفظ کرے لہٰذا ایسے فرد کا خلیفہ کے لئے انتخاب کیا جائے جو سب کے لئے یا واضح اکثریت کے لئے قابل قبول ہو اس طرح وہ امت کی وحدت و اجتماعیت کو مستحکم رکھ سکے گا، یہ وہی کر سکتا ہے جس کے اقتدار و حکومت کا دائرہ زیادہ وسیع و ہمہ گیر ہو۔

اصول مشاورت

نظم حکومت میں شوریٰ کو دستوری حیثیت حاصل ہے۔ قرآن حکیم نے اجتماعی امور طے کرنے کے لئے شوریٰ کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کی دو مشہور آیات ہیں جن سے مسلم فقہاء نے استدلال کیا ہے۔ پہلی آیت آل عمران کی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (آل عمران، ۳:۱۵۹)

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ (اے محمدؐ) آپ کی افتاد مزاج ان لوگوں کے لئے نرم ہے، اگر آپ درشت خو اور سخت مزاج ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، تو آپ ان سے درگزر کریں۔ ان کے لئے (اللہ تعالیٰ سے) مغفرت مانگیں اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہیں۔ اور جب آپ فیصلہ کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کریں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے اوپر اعتماد کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت مبارکہ سے قائدین اور حکمرانوں کے عوام سے تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے مثلاً حکومت اور عوام کے درمیان تعلقات میں جذبات رحم اور نرم مزاجی کا غلبہ ہونا چاہیے، حکومت کو عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔ بلکہ حاکم وقت میں اخلاص کا درجہ اس قدر بلند ہونا چاہیے کہ وہ اپنے تنہائی کے لمحات میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں امت کے لئے دعا مغفرت کیا کرے۔ باہمی امور میں لوگوں سے مشورہ کیا کرے اور جو رائے مشورہ کی روشنی میں طے پا جائے اس پر پورے عزم اور اللہ تعالیٰ پر توکل کے ساتھ عمل درآمد کرے۔

ابو حیان اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں ایک اصولی نکتہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو

امت مسلمہ کے باہمی معاملات میں مشورہ کا حکم اس لئے دیا تھا کہ تاکہ مشاورت کو قانونی حیثیت حاصل ہو جائے' اور آپ ؐ کے بعد لوگ اپنے ان تمام معاملات میں' جہاں وحی خاموش ہو' باہمی مشورہ سے معاملات طے کریں۔ دوسری آیت سورہ شوریٰ میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (شوریٰ' ۴۲: ۳۷۔۳۸)

اور وہ بڑے بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے ہیں' اور جب غصہ میں ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں' اور جنہوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا اور نماز کا اہتمام کیا' اور ان کے باہمی معاملات مشاورت سے طے ہوتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

سورہ شوریٰ کی پہلی آیت میں اہل ایمان کی لازمی صفات اور فرائض کو بیان کیا گیا ہے' مثلاً کبائر اور فحاشی سے اجتناب کرنا یا غصہ پر قابو رکھنا بلکہ اس حالت میں عفو و درگزر کرنا وغیرہ۔ جب کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان' نمازوں کا قیام' باہمی معاملات میں مشاورت اور اپنے مال میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا' وغیرہ۔ اس آیت مبارکہ کا اسلوب قابل توجہ ہے کہ اس میں اقامت صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے درمیان شوریٰ کا ذکر ہے جو اس کی اہمیت اور اجتماعی نظام میں اس کے بنیادی مقام کو ظاہر کرتا ہے۔

بعض فقہاء نے شوریٰ کے مقاصد کا ذکر کیا ہے۔ نظم شوریٰ کے قیام کے ساتھ اس بات پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ یہ مقاصد کس حد تک حاصل ہو رہے ہیں' مثلاً یہ کہ

۱۔ اجتماعی نظم اور معاشرہ کو قوت و استحکام حاصل ہو (لیتساعد وا بارائھم)

۲۔ امت کے لئے باہمی اتفاق وحدت کا باعث بنے (اجتماع الکلمہ)

۳۔ آپس میں محبت اور تعلق بڑھے۔ (التحاب)

۴۔ اور خیر کے کاموں میں باہمی تعاون پیدا ہو (التعاضد علی الخیر)[۶]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شوریٰ کا طریقہ کار جو بھی ہو نظر نتائج و مقاصد پر رہنی چاہیے۔ لہٰذا وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے ان مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔

عہد نبوی ﷺ میں امت کے اجتماعی معاملات میں براہ راست لوگوں سے مشورہ کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور بالواسطہ مشوروں کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں طریقے سنت ہیں۔ حالات اور ضرورت کے مطابق جو طریقہ مناسب ہو امت اسے اختیار کر سکتی ہے۔ غزوہ احد کے موقعہ رسول اللہ ﷺ نے براہ راست

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کہ مدینہ منورہ شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے یا شہر سے باہر نکل کر لڑا جائے۔ اکثر صحابہ کرام جن کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی اس رائے کے حامی تھے کہ مدینہ منورہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ مشورہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسی رائے کو قبول فرمایا۔ قبیلہ ہوازن کے جنگی قیدیوں کا مسئلہ بھی پہلے عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کے لئے مسجد میں پیش کیا گیا لیکن جب کچھ لوگ جنگی قیدیوں کے ساتھ احسان کے برتاؤ اور اس کے دور رس اور مثبت اثرات کو نہ سمجھ سکے اور فکری خلفشار کا شکار رہے تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ اپنے نمائندوں کو بھیجیں تاکہ وہ آپ لوگوں کی طرف سے اس موضوع پر گفتگو کریں اور اپنی رائے دیں۔ بعد میں قائدین (عرفاء) نے مشاورتی اجلاس میں شرکت کی اور اس مسئلہ کو حل کیا جس کے نتیجہ میں تمام جنگی قیدی بغیر کسی معاوضہ کے رہا کر دیئے گئے۷۔

اسی طرح اگر کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا جس کا تعلق ملک کی سلامتی یا دفاع سے ہوتا تو راز داری کی مصلحتوں کے پیش نظر بہت ہی چیدہ لیکن صاحب رائے لوگوں سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ غزوہ احزاب کے موقع پر جب مدینہ کا محاصرہ لمبا ہو گیا تھا اور مسلمانوں پر بہت سخت وقت آن پڑا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا کہ اگر وہ اتفاق کریں تو قبیلہ غطفان کو مدینہ کی کھجوروں کی پیداوار میں سے ایک حصہ سالانہ دے کر اس بات پر تیار کر لیا جائے کہ وہ کفار کی مشترکہ فوج سے اپنے آپ کو الگ کر لیں۔ ان کے علیحدہ ہونے کا اثر مدینہ منورہ کا محاصرہ کرنے والے دیگر قبائل پر بھی پڑے گا اور ان کی قوت کمزور پڑ جائے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں پر ان کا دباؤ کمزور پڑ جائے گا اور مسلمانوں کو ان کے دباؤ اور محاصرہ سے نجات مل جائے گی۔ انصار کے ان دونوں قائدین نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ انہوں نے کفار کے حملوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے اور اسے کسی مثبت نتیجہ تک پہنچانے پر اصرار کیا۔ ان کے عزم و حوصلہ کو دیکھتے ہوئے آپ نے ان کی رائے سے اتفاق فرمایا۸۔

فنی اور تکنیکی معاملات میں ماہرین کی رائے کو وزن دیا جاتا تھا' مثلاً جنگ بدر میں اسلامی فوج کے کیمپ اور جگہ کے تعین میں حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کیا گیا' اسی طرح غزوہ احزاب کے موقعہ پر مدینہ منورہ کے دفاع کے لئے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے کے مطابق طویل و عریض خندق بنانے کا طریقہ اختیار کیا گیا۹۔ اس طرح امت کے اجتماعی امور میں مشاورت کا اصول سنت میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

طرز حکومت

اسلام میں طرز حکومت کا ایک خاکہ خلافت کی اصطلاح سے ابھرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا ہے کہ یہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگرانی میں رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا نام ہے۔ خلافت میں ایک پہلو تو نیابت رسول

کا ہے جو بہت اہم اور کڑی ذمہ داریاں قائدین امت پر عائد کرتا ہے' اس حیثیت میں خلیفہ کی اہلیت اور حقوق و فرائض کا تعین بھی ہوتا ہے دوسرا پہلو وکالت کا ہے۔ خلافت عمومی کی جو ذمہ داریاں امت مسلمہ کے عام افراد پر عائد ہوتی ہیں ان سے وہ اجتماعی طور پر عہدہ برا ہونے کے لئے اپنے میں سے ایک باصلاحیت اور موزوں فرد کا انتخاب کرتے ہیں۔ پھر اس کی قیادت میں اپنے اجتماعی فرائض کی تکمیل کے لئے جدو جہد کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے خلیفہ کی حیثیت امت کے وکیل کی ہے۔ فقہاء نے بھی خلیفہ کو امت کی جانب سے وکیل قرار دیا ہے اور اس پہلو کی بنا پر بہت سے علمی اور دستوری نکات بیان کئے ہیں[۱]۔ اس طرح خلیفہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی جواب دہ ہے اور امت مسلمہ کے سامنے بھی۔ مسئولیت کا طریقہ کار کوئی بھی اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ خلیفہ کو نیابت اور وکالت کی وجہ سے ایک اہم مقام اور مرتبہ حاصل رہا ہے' لہٰذا مسئولیت کے طریقہ کار اور انداز میں عزت و احترام اور تہذیب و شائستگی کو پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اسلام کی سیاسی تعلیمات میں زیادہ زور اصولی باتوں پر دیا گیا ہے۔ تفصیلات کا معاملہ ہر دور اور ہر زمانہ کی ضروریات اور تغیرات کی وجہ سے امت پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ امت کے ذہین اور صاحب بصیرت و کردار لوگ اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر طے کر لیا کریں' یہ بات بہر حال طے شدہ ہے کہ طرز حکومت شورائی ہوگا۔ رہا یہ مسئلہ کہ شورائی نظام پارلیمانی طرز کا ہوگا یا اس سے مختلف کوئی اور انداز کا ہوگا تو اس معاملہ کو بھی مشورہ کے ذریعے ہی طے کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قسم کا شورائی نظام حالات اور ضرورت کو پیش نظر رکھ کر مناسب سمجھا جائے گا اسے اپنا لیا جائے گا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ نظام ہماری اقدار اور ہماری تہذیب کے تحفظ اور اس کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہو۔ اسلامی مملکت میں عاملہ یا انتظامیہ کے پاس اختیارات بطور امانت ہوتے ہیں ان کا اصل کام احکام شریعت کا نفاذ' دارالاسلام کا دفاع اور معاشرہ میں امن و سکون اور عدل و انصاف کے لئے مناسب حالات پیدا کرنا ہے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ لوگ اولوالامر کہلاتے ہیں ان کی اطاعت کرنا اور ان کے احکام کو توجہ سے سننا واجب ہے اس لئے کہ عاملہ مقاصد نبوت کو قائم و دائم رکھتی ہے۔ نیکی اور معروف کے قیام میں ان کے ساتھ بھرپور تعاون ضروری ہے۔ اولوالامر یا انتظامیہ کے لئے سمع و طاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے دائرے میں رہتے ہوئے حاصل ہے۔ معصیت کی جب حدود شروع ہو جائیں تو اطاعت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ "اللہ تعالیٰ کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی"۔

مقننہ

مقننہ کے بارے میں یہ بات طے کرنا ہوگی کہ قانون سازی کا کام کرنے کے لئے کوئی مستقل کمیٹی ہونی

چاہیے یا نہیں۔ اگر اس کام کے لئے کوئی کمیٹی تشکیل دی جائے جو ایسے افراد پر مشتمل ہو جو قانونی امور میں فہم و بصیرت رکھتے ہوں اور جو ان حدود میں رہ کر کام کر سکیں جو قرآن و سنت نے مقرر کی ہیں تو اس قسم کی مجلس اپنے دائرے میں رہ کر کام کر سکتی ہے۔

مقنّنہ کا پہلا کام یہ ہوگا کہ احکام شریعت کے نفاذ اور تطبیق کا طریقہ کار طے کرے اور ان کے نفاذ میں حکومت کی مدد کرے دوسرے وہ امور جن میں قرآن و سنت خاموش ہوں ان میں مقنّنہ اجتہاد کے ذریعہ قانون سازی کا کام کر سکتی ہے۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں طریقہ کار یہ تھا کہ جب کوئی معاملہ پیش ہوتا اور اس سے متعلق قرآن و سنت میں حکم نہیں ہوتا تھا تو مزید تلاش و جستجو کے لئے منادی کرا دی جاتی تھی۔ لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے پھر سب جمع ہونے والے صحابہ کرام سے پوچھا جاتا کہ اس متعلقہ معاملہ میں کسی کے علم میں رسول اللہ کا کوئی فرمان یا فیصلہ ہو تو وہ بتائے اگر کسی کے پاس کوئی حدیث یا سنت ہوتی تو وہ بیان کر دیتا۔ اور فیصلہ سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق کر دیا جاتا اور اگر تلاش و جستجو کے باوجود کوئی حدیث نہ ملتی تو پھر صحابہ کرام سے مشورہ کیا جاتا' مشورہ سے جو کچھ طے ہو جاتا اسے جاری و نافذ کر دیا جاتا[۱]۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عام طریقہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی بہت حد تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری چھ سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیادہ تر دور میں شورشیں اور ہنگامے اٹھنے لگے تھے اس لئے اس دور میں ان کی توجہ کا زیادہ محور ان ہنگاموں سے نمٹنا رہا۔ صحابہ کرام میں خلفاء اربعہ کے علاوہ عبداللہ بن مسعود حضرت ابو موسیٰ الاشعری' حضرت معاذ بن جبل' حضرت ابی ابن کعب' حضرت زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضوان اللہ علیہم قانونی ماہرین تھے۔ تابعین کے دور میں فقہاء سبعہ کو نمایاں مقام حاصل رہا[۲]۔ اپنے دور میں ہونے والی قانون سازی میں ان کا کردار بہت واضح ہے حتیٰ کہ اس دور کے قاضی بھی ان سے مشورہ لیتے تھے اور ان کی فقہی آراء کی پابندی کرتے تھے۔ ان تمام فقہاء نے قانون سازی کا کام آزادانہ طور پر کیا' کسی حکومت کے ماتحت رہ کر یا حکومت کی قائم کردہ کمیٹی کے طور پر کام نہیں کیا۔ مدینہ منورہ کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی فقہاء اسی طرح آزادانہ حیثیت میں کام کرتے رہے۔ تبع تابعین کے زمانے میں فقہ میں فنی اور علمی لحاظ سے بہت ترقی ہوئی۔ ماہرین قانون نے اصول قانون کو علمی انداز میں پیش کیا۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب نے مل کر تدوین فقہ کے لئے ایک اکیڈمی کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے نمایاں شاگردوں مثلاً امام ابو یوسف' امام زفر بن ہذیل' محمد بن حسن شیبانی' حسن بن زیاد لؤلؤی وغیرہ نے اسلامی قانون کے ارتقاء میں بہت نمایاں کام کیا ہے۔ یہ اکیڈمی حکومت کے زیر اثر نہیں تھی امام ابو حنیفہؒ نے بھی حکومت کے ماتحت رہ کر یا حکومت وقت سے مراعات حاصل کر کے کام نہیں کیا بلکہ حکومت کی نظر میں

اپنے بعض افکار کی وجہ سے معتوب رہے اور قید و بند کی سزائیں برداشت کیں۔ امام دارالہجرۃ حضرت امام مالکؒ نے مدینہ منورہ کو اپنا مرکز بنایا اور یہاں رہ کر تدوین قانون میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ امام مالکؒ کا مدرسہ بھی کسی حکومت کے تابع نہیں تھا بلکہ انہوں نے بھی بالکل آزاد فضا میں کام کیا۔ امام مالکؒ کے بھی بعض حکمرانوں سے اختلافات رہے ہیں جن کی وجہ سے انہیں بھی سخت سزائیں برداشت کرنا پڑیں۔ امام شافعیؒ نے بھی حکومت کی سرپرستی کے بغیر فقہ و اصول فقہ پر بہت وقیع کام کیا ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے بھی حکومت کی سرپرستی اور مراعات سے الگ تھلگ رہ کر کام کیا اور فقہ و قانون میں ایک نئے اسکول کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اسلامی تاریخ میں قانون سازی کا تمام کام حکومتوں سے علیحدہ ہی ہوا ہے اور ان حضرات کا تجربہ بہت کامیاب رہا ہے۔

عدلیہ

کوئی دستوری نظام اور کوئی معاشرہ عدل و انصاف کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا' اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں عدل و انصاف پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن سے قیام عدل کی فرضیت کا علم ہوتا ہے' خصوصاً حکومت اور اجتماعی نظم کے قیام کا مقصد تو عدل و انصاف ہی کا قیام ہے۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (ص' ۳۸:۲۶)

اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا لہٰذا تم لوگوں میں حق و انصاف کے ساتھ فیصلے کرو' اور آئندہ بھی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرنا اس لئے کہ یہ (خواہشات) تمہیں اللہ کے رستہ سے بھٹکا دیں گی۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (نساء' ۴:۵۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو لوگ امانتوں کے اہل ہیں امانتیں انہی کے سپرد کر دیا کرو' اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں بہت اچھی نصیحت کرتا ہے' بیشک اللہ تعالیٰ سنتا اور دیکھتا ہے۔

ابن جریر طبری کی رائے ہے کہ اس آیت میں مسلمان حکمرانوں کو خطاب کیا گیا ہے کہ وہ اس بات کے پابند ہیں کہ انہی لوگوں کو عہدے اور منصب دیں جو اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے اہل ہوں اور فیصلے کرنے میں عدل و انصاف سے کام لیں[۱۳]۔ امانت کا لفظ بھی اس آیت مبارکہ میں وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے' امانت کا تعلق خواہ حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے' ہر قسم کی امانت اس میں شامل ہے۔ اور "واذا حکمتم بین

الناس" میں اسی امانت کے سب سے اہم پہلو کی تفصیل ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل ۱۶۔ ۹۰)

بیشک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (مائدہ، ۵:۸)

اے ایمان والو! عدل کے علمبردار بنو، اللہ کے لئے اس کی شہادت دیتے رہو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو کہ یہی تقویٰ کے قریب تر ہے۔

اس آیت میں یہ اصولی ہدایت دی گئی ہے۔ کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں دوست و دشمن سب برابر ہیں، کسی کی دشمنی یا کسی کی دوستی بھی ہمیں حق و انصاف سے نہ ہٹائے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک اور آیت ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (نساء، ۴:۱۳۵)

اے ایمان والو! حق پر جمے رہو اللہ تعالیٰ کے لئے شہادت دیتے ہوئے اگرچہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے والدین اور تمہارے قرابت مندوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا زیادہ حق دار ہے۔ لہٰذا تم نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق و انصاف سے ہٹ جاؤ، اور اگر کوئی گول مول شہادت دو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے، اچھی طرح باخبر ہے۔

عدل و انصاف کا قیام صرف باہمی جھگڑے اور مخاصمات طے کرنے میں ہی نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر معاملہ میں اسے پوری طرح ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون اور سیاست و حکومت پر لکھنے والے دنیا بھر کے ماہرین اور اہل علم نے کبھی بھی اس قدر اہمیت اور اہتمام کے ساتھ نظام عدل پر نہیں لکھا جتنا مسلمان علماء نے لکھا ہے اس لئے کہ عدل کا قیام دین کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے۔ خاندانی نظام، باہمی معاشرتی و سیاسی معاملات، معاشی امور، قوموں اور ممالک کے باہمی تعلقات حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف ضروری ہے۔ عدلیہ سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور خط حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام دستوری اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک طویل خط ہے اور اصول عدل پر ایک جامع تحریر ہے، یہاں اس کے مندرجات پر بحث نہیں کی جا سکتی، دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے حاشیہ پر حوالے موجود ہیں۔ تفصیلات کے لئے ان کتابوں کی

طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

عدلیہ کا مقام

عدلیہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہر قسم کے اثر و رسوخ سے آزاد ہوتی ہے۔ انتظامیہ یا سربراہ مملکت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ عدالت کو کسی خاص فیصلہ پر مجبور کرے یا کسی کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے کیلئے اس پر دباؤ ڈالے۔ عدلیہ اپنے دائرہ اختیار میں اس حد تک آزاد ہے کہ سربراہ مملکت کو عدالت میں طلب کر سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ کا مشہور فیصلہ جو انہوں نے خلیفہ وقت حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ کے خلاف دیا تھا ایک عمدہ نظیر ہے۔ عیینہ بن حصن جو اپنے قبیلہ کے سردار تھے رسول اللہ ﷺ نے انہیں تالیف قلب کے طور پر کچھ زمین دی تھی' حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور ان سے بھی ایک قطعہ زمین حاصل کر لیا اور اس بارے میں ایک تحریر بھی لکھوا لی' طلحہ بن عبید اللہ نے جو عیینہ کے دوست تھے مشورہ دیا کہ عمرؓ بہت مضبوط ہیں اور مسلمانوں میں ان کا بہت نمایاں مقام ہے لہٰذا اگر اس تحریر پر ان کے دستخط بھی ہو جائیں تو پھر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں رہے گی۔ چنانچہ وہ زمین کی دستاویز لے کر حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ مجھے خلیفہ رسول ﷺ نے قطعہ زمین دیا ہے اور یہ تحریر لکھ دی ہے آپ بھی اس پر اپنی مہر لگا دیجئے۔ حضرت عمرؓ جو عیینہ بن حصن' اقرع بن حابس وغیرہ کے کردار اور مسلم معاشرہ میں ان کی حرکات سے مطمئن نہ تھے نہ صرف یہ کہ اپنے دستخط کرنے اور مہر لگانے سے انکار کر دیا بلکہ اس دستاویز ہی کو چاک کر کے پھینک دیا۔ عیینہ بن حصن غصہ میں واپس حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور بھڑکانے کے انداز میں کہا کہ اے ابوبکرؓ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟ حضرت ابوبکرؓ مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ گئے۔ فرمایا عمر ہی خلیفہ تھے اگر انہوں نے انکار نہ کیا ہوتا۔ عیینہ بن حصن نے جب یہ دیکھا کہ ابوبکرؓ کی طرف سے حضرت عمر کے خلاف کوئی رد عمل نہیں ہوا تو اس نے درخواست کی کہ اسے نئی دستاویز لکھ دی جائے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ جس فیصلہ کو عمرؓ نے رد کر دیا ہو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتا[۱۴]۔ یہ غالباً عدلیہ کی تاریخ میں پہلا فیصلہ تھا کہ حکومت وقت کے فیصلہ کو عدالت نے کالعدم قرار دیا اور حکومت نے بھی اسے پورے شرح صدر کے ساتھ قبول کیا۔ اسلامی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ قاضی نے سربراہ مملکت یا اس کے کسی فیصلے کی سماعت کی اور فیصلہ ان کے خلاف کیا۔

فقہاء کا نقطہ نگاہ یہ رہا ہے کہ اگر عدالت کوئی فیصلہ کر دے تو حکومت کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ عدالت کو اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت کرنے پر مجبور کرے۔

لقاضی اذا قضی فی حادثة فی الحق ثم امر السلطان ان یسمع هذه الحادثة ثانیا یشهد من العلماء لایفترض علی القاضی ذالک[۱۵]

جب قاضی کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کر چکے اور اس کے بعد سلطان اسے حکم دے کہ وہ علماء کی موجودگی میں اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت کرے تو اس کا حکم ماننا قاضی کے لئے ضروری نہیں۔

عدلیہ صرف قرآن و سنت کی پابند ہے یا ایسے دستور و قانون کی جو قرآن و سنت کی روشنی میں طے کیا گیا ہو اور اسے مملکت نے ملکی دستور و قانون کے طور پر نافذ کر دیا ہو۔ عدالت تو اس بات کی پابند ہے کہ وہ اس امر کا جائزہ لے اور اسے یقینی بنائے کہ اس کے ذریعہ معاشرہ میں عدل و انصاف قائم ہو رہا ہے اور یہ کہ لوگوں کو بغیر کسی رکاوٹ کے انصاف مل رہا ہے۔

اسلامی دستور میں صوبائی خود مختاری کا تصور

صوبوں کی خود مختاری یا مضبوط و با اختیار مرکز اور کم اختیارات والے صوبے ایسے مسائل ہیں جو بنیادی اہمیت کے حامل نہیں۔ یہ فروعی مسائل ہیں جنہیں اہل علم اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق ہر دور اور ہر زمانہ میں باہمی مشورہ سے طے کر سکتے ہیں۔ ایک اسلامی مملکت کے لئے چار چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔ دین و شریعت کی بالادستی
۲۔ امت اسلامیہ کی وحدت
۳۔ عدل و انصاف کا قیام
۴۔ مملکت اور ملت اسلامیہ کا تحفظ و دفاع

یہ بنیادی اصول ہیں جن کا تحفظ اور قیام خلافت کے فرائض میں داخل ہے۔ ان اصولوں کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ یا ان کی حدود میں رہتے ہوئے صوبوں کے اختیارات کے مسئلہ کو طے کیا جا سکتا ہے۔ اختیارات کی تقسیم و تفویض ایک انتظامی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ یہ تقسیم کار ہر دور کے معاشرتی و سیاسی حالات اور انتظامی نظم و نسق پر موقوف ہے اور حالات و ضرورت کے تحت ان میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔ اگر صورت حال ایسی ہو کہ با اختیار صوبے اسلامی مملکت کے مذکورہ مقاصد کے حصول میں مد و معاون ہو سکیں اور اپنے انتظامی امور اور فرائض منصبی زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکیں تو انہیں داخلی معاملات میں زیادہ خود مختاری دی جا سکتی ہے۔ اختیارات کے تعین میں دینی و ملی مصلحتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ اجتماعی امور سے متعلق ہے اس لئے ضروری ہو گا کہ شوریٰ کے ذریعہ طے کیا جائے۔ اجتماعی اور سیاسی امور میں شریعت اور خلفاء راشدین کا رجحان یہ رہا ہے کہ اس قسم کے امور کو حتی الامکان اجماع کے ذریعہ طے کیا جائے۔ اگر مکمل اجماع ہو جائے تو بہت بہتر ہے ورنہ واضح اکثریت کا فیصلہ بھی حجت ہے[۱۶]۔

مسلم تاریخ میں صوبائی خود مختاری سے متعلق مختلف نظائر ملتے ہیں۔ عہد نبوی ﷺ میں رسول اللہ نے جن

گورنروں کا تقرر فرمایا تھا اور جنہیں مختلف صوبوں میں امیر مقرر فرمایا انہیں حدود شریعت میں رہتے ہوئے وسیع انتظامی اختیارات دیئے تھے۔ معاذ بن جبل ؓ کی مثال موجود ہے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ نے ان تمام معاملات میں اجتہاد کی اجازت دی تھی جن میں قرآن و سنت خاموش ہیں۔ اجتہاد اگرچہ ایک فنی اصطلاح ہے اور اس کے لئے علم و تقویٰ کا وہ معیار ضروری ہے جس کی بنا پر ایک فرد مجتہد قرار پاتا ہے لیکن یہاں ہم صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ اجتہاد کی صورت میں اختیارات میں وسعت کا پہلو بھی مضمر ہے' اور شائد اس کے بغیر اس دور میں موثر طور پر انتظامی امور کو انجام دینا بھی مشکل تھا۔

بحرین کے حکمران منذر بن ساوی نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسی کو صوبہ کا امیر مقرر کیا اور اس کے اختیارات میں کوئی کمی نہیں کی کیونکہ اسلام قبول کر کے اس نے اپنے لئے ایک نئے مقصد زندگی کا انتخاب کر لیا تھا اور تسلیم و رضا نے اس کی زندگی کا نیا رخ متعین کر دیا تھا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اسلامی نظام حیات کو اپنانے' دین کو سمجھنے اور اسے قائم کرنے میں بحرین کے حکمران کی مدد فرمائی۔ انتظامی اختیارات اسی طرح باقی رہے' البتہ عقیدہ و فکر کی تبدیلی کے بعد سب کچھ دین و عقیدہ کے تابع ہو گیا تھا۔ حبشہ کے حکمران نجاشی' عمان کے حکمران جلندی و جیفر اور یمن کے حکمران باذان بھی قبول اسلام کے بعد بدستور اپنے علاقوں میں حکمران رہے۔

حضرت علی ؓ کے دور میں صوبہ شام کو مکمل طور پر داخلی خود مختاری حاصل رہی۔ اصولی طور پر صوبہ شام خلافت اسلامیہ ہی کا ایک حصہ تھا۔

بعد کے ادوار میں گورنروں کے اختیارات میں وسعت و کمی کے پیش نظر مختلف اصطلاحات وجود میں آئیں' مثلاً والی' عامل اور امیر وغیرہ۔ وہ گورنر جسے امیر کا لقب دیا جاتا تھا زیادہ بااختیار ہوتا تھا جب کہ والی امیر کی بہ نسبت کم اختیار کا مالک ہوتا تھا' اسلامی مملکت کے دستوری تصور کے مطابق گورنری کی دو قسمیں ہیں' ایک ولایت التفویض یا ولایت عامہ' اس صورت میں گورنر کو زیادہ اختیارات مل جاتے تھے۔ دوسری قسم ولایۃ خاصۃ یاولایۃ التنفیذ امارۃ خاصۃ کہلاتی تھی' اس صورت میں محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ اس نظریہ پر ماوردی' ابو یعلی حنبلی اور ابن جماعہ نے بحث کی ہے[۱۷]۔

مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں اختیارات

مندرجہ بالا بحث سے صوبائی خود مختاری کا تصور واضح ہو گیا ہے۔ اسلامی دستور اور تاریخ دونوں میں جو تصور رہا ہے اسے ہم نے مختصر بیان کر دیا ہے۔ اس بحث کی روشنی میں اب اس مسئلہ کو حل کرنا مشکل نہیں۔ اصل اور بنیادی چیز ان مقاصد کا حصول ہے جس کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کا طریقہ کار' نیز انتظامی اور سیاسی امور میں حالات اور اجتماعی مصلحت کے تحت ضروری تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ یہ مسئلہ

چونکہ انتظامی اور سیاسی نوعیت کا ہے لہٰذا اسے دستور میں شوریٰ کے ذریعہ طے کیا جا سکتا ہے پھر جن اختیارات کا تعین دستور میں کر دیا جائے ان کی پابندی کرنا مرکز اور صوبوں دونوں پر لازمی ہو گا۔

حصہ دوم

حقوق و فرائض

اسلامی ریاست میں شہریوں کے بنیادی حقوق

فقہاء نے اسلامی مملکت کے شہریوں کے حقوق پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ حقوق کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اولاً" وہ بنیادی حقوق جو ہر فرد کے لئے لازمی اور ضروری ہیں۔ یہ پانچ حقوق ہیں۔

دین کا تحفظ

حفاظت دین کا حق ہر فرد کو حاصل ہے کہ وہ دین کے تحفظ کے لئے دینی تعلیم کا اہتمام کرے اور اس کے لئے مدارس قائم کر کے اور دینی تعلیم کے مطابق عبادات و مساجد کا نظم قائم کرنے کو عملی زندگی میں جاری و نافذ کرنے کے لئے ضروری اقدامات اور انتظامات کرے۔

جان و آبرو کا تحفظ

زندگی اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ نعمت ہے جو محترم و مقدس ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کی زندگی کی ضمانت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ضمانت پر حاصل ہے جسے کوئی سلب نہیں کر سکتا۔ اسلامی مملکت کے شہریوں کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تحفظ کے لئے اور اپنے جسم و جان کی سلامتی کے لئے تمام ضروری تحفظات حاصل کریں۔ حکومت کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے اور ہر شہری کو اس بات کی ضمانت فراہم کرے کہ اس کی جان اور عزت و آبرو محفوظ ہے۔ شریعت نے کسی کی عزت و آبرو سے کھیلنے پر سخت سزا مقرر کی ہے۔

مال کا تحفظ

شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے جو کچھ انسان اپنی محنت اور جدو جہد سے کماتا ہے وہ مال بھی محترم ہے۔ اس میں نہ کوئی فرد دست درازی کر سکتا ہے نہ حکومت ناجائز طریقہ سے اسے ہڑپ کر سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے!

کل المسلم حرام دمہ و مالہ وعرضہ

ہر مسلمان محترم ہے اس کا خون' اس کا مال اور اس کی عزت' سب ہی مقدس محترم ہیں۔

حجتہ الوداع کے مقدس و محترم موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ نے یہ پیغام واضح الفاظ میں دیا۔

فان دمائکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا۔

تمہاری جان و مال اور عزت و آبرو اسی طرح محترم ہے جس طرح آج کا یہ دن محترم ہے۔

کسی کے مال میں حکومت کو بھی مداخلت کرنے یا بالجبر لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قاضی ابو یوسف نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر حکومت کسی شخص کے قبضہ سے کوئی چیز نہیں لے سکتی۔ اگر حکومت لینا چاہے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں پہلی یہ کوئی فرد اپنی مرضی اور خوشی سے حکومت کو دینا چاہتا ہے دوسرے یہ کہ حکومت اس چیز کا مناسب معاوضہ دے کر اس پر قبضہ کر سکتی تاکہ اسے امت کی اجتماعی ضرورت کے لئے استعمال کیا جا سکے۔

عقلی و ذہنی صلاحیتوں کا تحفظ

عقل و شعور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے' اس کا تحفظ شریعت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ اسلامی مملکت کے شہریوں کا یہ حق ہے کہ ان کی عقلی و فکری صلاحیتوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ شریعت ان تمام چیزوں کی قانونی طور پر روک تھام کرتی ہے جو عقل اور ذہن کو معطل کر دیتی ہوں۔ یا جو چیزیں انہیں نقصان پہنچاتی ہوں' شراب نوشی یا منشیات کا استعمال اسی لئے شریعت میں ممنوع قرار دیا گیا ہے' عقلی و فکری صلاحیت کا دارومدار حواس خمسہ پر منحصر ہے لہٰذا انسانی حواس کی حفاظت بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح عقل کی حفاظت ضروری ہے۔ علم و معرفت کا حصول اسلام میں ہر فرد کر لئے ضروری ہے اور عقل و حواس اور ذہنی صلاحیت حصول علم کا ذریعہ ہیں' وحی کا فہم و ادراک بھی ان پر موقوف ہے اور کتاب الٰہی کے مضامین کو سمجھنا بھی ان پر موقوف ہے اس لئے عقلی اور فکری صلاحیت کی ہر صورت میں حفاظت ضروری ہے۔

حفاظت نسل

خاندان معاشرہ کا بنیادی یونٹ ہوتا ہے' یہ چھوٹا یونٹ اگر ٹھیک ہو تو سارا معاشرہ ٹھیک ہوتا ہے اگر اس میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو سارا معاشرہ بگڑ جاتا ہے۔ اس لئے شریعت نے سلسلہ نسل اور اس کی حفاظت کے لئے ازدواج اور خاندانی نظام کے لئے ایسے قواعد و ضوابط عطا کئے ہیں جن کی وجہ سے نسل و خاندان کو تحفظ حاصل ہو سکے۔ اس کے لئے ایک طرف نکاح اور اس سے متعلق ضروری احکام عطا کئے اور پھر عقد نکاح سے جو خاندان وجود

میں آتا ہے اس کی حفاظت اور استحکام کے لئے بھی واضح ہدایات دی ہیں دوسری طرف ایسے افعال کو ممنوع قرار دیا ہے جن کی وجہ سے نسل مشتبہ ہو جائے یا خاندان کا استحکام متاثر ہوتا ہو۔ چنانچہ جہاں شریعت نے ازدواجی تعلقات سے متعلق احکام و ضوابط دیئے ہیں تو ساتھ ہی وہاں زنا اور فحاشی کے ذرائع کی بھی پوری طرح روک تھام کی ہے[۱۸]۔

یہ پانچ بنیادی حقوق اصطلاح فقہاء میں ضروریات کہلاتے ہیں۔ ان پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ ان کے بعد حقوق کی ایک اور قسم ہے جو حاجیات کہلاتے ہیں۔ یہ وہ حقوق ہیں جن کے بغیر اگرچہ زندگی کا نظام تو معطل نہیں ہوتا لیکن مشکلات ضرور پیدا ہو جاتی ہیں۔ مقاصد شریعہ میں یہ بھی شامل ہے کہ زندگی کے سفر میں حائل مشکلات اور رکاوٹوں کو بھی دور کیا جائے۔ احکام' معاملات اور عبادات میں سہولت کو پیش نظر رکھا جائے۔ حالت سفر میں نمازوں میں قصر' رمضان المبارک کے روزے کھول لینے کی اجازت یا بیماری کی صورت بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھنے کی اجازت اصول یسر کی بنیاد پر ہیں۔ حاجیات کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیات ہیں:

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ (بقرہ' ۲: ۱۸۵)

اللہ تعالیٰ تمہارے لئے سہولت چاہتا ہے تمہیں سختی اور مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ (بقرہ ۲: ۲۸۶)

اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی استطاعت کے مطابق ہی مکلف بناتا ہے۔

تیسرا درجہ تحسینیات کا ہے۔ اس میں وہ چیزیں داخل ہیں جو زندگی میں نکھار اور حسن پیدا کرتی ہیں یعنی مباحات کی حدود میں رہتے ہوئے ایسی چیزوں کو اپنانا کہ جن کی وجہ سے حسن و زینت پیدا ہو' یا جن سے انسانی عمل میں نفاست اور خوبصورتی پیدا ہو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بہت ساری زینت کی چیزیں پیدا کی ہیں۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ الْکَوَاکِبِ (صافات' ۳۷: ۶)

ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین کیا۔

یہ زینت اس لئے ہے کہ دیکھنے والے کو خوبصورت لگے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اعراف' ۷: ۳۲)

کہہ دیجئے آخر کس نے حرام کیا اس زیب و زینت کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی یا جو پاکیزہ رزق اللہ نے پیدا کیا؟

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف' ۷: ۳۱)

اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنی آرائش کا اہتمام کرو۔

وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (قصص' ۲۸: ۷۷)

احسان کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ احسان کیا۔

احسان میں ظاہری اور باطنی حسن پوری طرح موجود ہوتا ہے۔ احسان حصول کمال کی جدو جہد کا نام ہے' اور درجہ کمال عبادات میں ہو یا اخلاقیات میں یا کسی بھی عمل صالح میں اس میں حسن و جمال پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ حدود شریعت میں رہتے ہوئے زینت و پاکیزگی' نفاست اور خوبصورتی کو بھی مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا اصولی بحث کے بعد شہریوں کے تمام حقوق کی فہرست دینا ضروری نہیں ہے بعض بنیادی حقوق ہیں جن کی حفاظت ہر دور اور ہر زمانہ میں ضروری ہے۔ لیکن حالات اور تغیرات زمانہ کی وجہ سے نئے حقوق بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس موضوع پر علمی انداز میں قدرے وضاحت کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ انہوں نے شہریوں کے چودہ حقوق کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں۔ جان و مال اور ناموس کی حفاظت' ذاتی ملک کی حفاظت' شخصی آزادی' عقیدہ و مسلک کی آزادی' قانونی مساوات' معاشرتی مساوات' تقسیم .فے میں مساوات' حاجت مند کی کفالت' ناقابل ادا قرضوں کی ادائیگی' بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف' تعلیم' لوگوں پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنا' اطاعت الٰہی کے خلاف لوگوں کو کوئی حکم نہ دینا' درخواست' فریاد اور اعتراض کرنے کا حق وغیرہ وغیرہ[۱۹]۔

شہریوں کے فرائض

اسلام میں جہاں' فرد کی اصلاح و فلاح کے لئے ہدایات ہیں وہاں اجتماعی نظم و ضبط کے لئے بھی واضح ہدایات موجود ہیں۔ بلکہ فرد کی اصلاح و تربیت بھی اس لئے ہے تاکہ وہ فرد معاشرہ کے لئے مفید ثابت ہو سکے اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے' اجتماعی اور ملی معاملات میں اپنے فرائض کی ادائیگی پورے احساس اور شعور کے ساتھ ادا کر سکے۔

اجتماعی اور ملی امور کی نگہبانی اور معاشرتی نظم و نسق اس بات پر مبنی ہوتا ہے کہ اس معاشرہ کے افراد کا اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے سلسلہ میں شعور کس قدر بیدار ہے۔ یہ احساس جس قدر بیدار ہوگا انسانی فکر اسی قدر مثبت اور تعمیری ہو گی۔ عزائم میں استحکام پیدا ہو گا اور عملی زندگی میں اس کے اچھے اور تعمیری نتائج بر آمد ہوں گے اس شعور اور احساس فرض سے جو اجتماعی نفسیات پیدا ہو گی وہ بھی تعمیری اور تخلیقی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں جہاں حقوق کا ذکر ہے وہاں فرض کی ادائیگی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ قرآن و سنت انسان میں احساس ذمہ داری کو اچھی طرح بیدار کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھے اور ان کی ادائیگی کے لئے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ بھی سمجھے۔ اجتماعی امور میں یقیناً معاشرہ کے سامنے بھی

جواب دہ ہونے کا تصور موجود ہے لیکن جن لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا شعور بیدار ہو جاتا ہے وہ کبھی بھی اجتماعی معاملات میں کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوتے' بلکہ ایسے لوگ ہی معاشرہ کے سامنے اپنے آپ کو ذمہ دار محسوس کرتے ہیں۔

قرآن و سنت میں ادائیگی فرض پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرتا رہے تو کسی کو اپنے حقوق کے لئے پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ لوگوں کو خود بخود حقوق ملتے رہیں گے۔

سمع وطاعت: اسلامی مملکت اور مسلم معاشرہ میں اجتماعی نظم و نسق چلانے اور دین کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ملت اسلامیہ کے افراد اور ان کی قیادت مل جل کر کام کرے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم ذمہ داری جو شہریوں پر عائد ہوتی ہے وہ سمع وطاعت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اولوالامر یا امت مسلمہ کی قیادت جو کچھ کہے یا حکم دے تو اسے غور سے سننا اور سمجھنا چاہیے۔ پھر اسے پورے اخلاص کے ساتھ تسلیم کرکے اس پر عمل بھی کرنا چاہیے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء' ۴: ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں اولوا الامر ہیں۔

قرآن و سنت میں صرف اطاعت کو ضروری قرار نہیں دیا گیا بلکہ اولوالامر کی بات یا حکم کو غور سے سننے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ صحیح اور معروف میں اطاعت لازمی ہے اور منکر میں کوئی اطاعت نہیں' اس اطاعت میں ریاکاری بھی شامل نہیں ہونی چاہیے بلکہ اخلاص و محبت کے جذبات کے ساتھ اطاعت کرنی چاہیے۔ حدیث رسول ﷺ میں اچھی حکومت کی علامت ہی یہ ہے کہ عوام اور حکمرانوں میں باہم محبت و دلی تعلق ہو۔

حکومت اور معاشرہ پر مختلف حالات اور ادوار آ سکتے ہیں۔ خوشحالی کا دور بھی ہو سکتا ہے اور سختی و تنگی کا دور بھی لیکن سمع و طاعت ہر حالت میں ضروری ہے۔ حکومت و مملکت کے احکام اجتماعی مفادات کے لئے ہوتے ہیں۔ اس میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ کسی فرد کا ذاتی مفاد مجروح ہوتا ہو یا یہ کہ اسے ذاتی طور پر اس فیصلہ سے اختلاف ہو پھر بھی اجتماعی مفاد کی خاطر سمع و طاعت واجب ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے۔

بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة فى العسر واليسر والمنشط والمكره[۲۰]

ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی سمع و طاعت پر تنگی میں بھی اور فراخی میں بھی' آسانی میں بھی اور سختی میں بھی' ہر حال میں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اسی لئے رسول کی اطاعت مطلق، کامل اور غیر مشروط ہے جب کہ اولوالامر کی اطاعت مقید و مشروط ہے[۲۱]۔

السمع والطاعة حق مالم یومر بالمعصیة فاذا امر بالمعصیة فلا سمع ولا طاعة
سمع وطاعت اولوالامر کا حق ہے جب تک وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں، جب بات معصیت کی ہو تو اس میں کوئی سمع و طاعت کی گنجائش نہیں۔

خیر خواہی: دوسرا اہم فریضہ جو ہر شہری پر عائد ہوتا ہے وہ خیر خواہی ہے۔ یعنی ہر فرد مملکت اسلامیہ کا خیر خواہ ہونا چاہیے۔ اور جو لوگ امت کی قیادت کر رہے ہوں ان کی مخلصانہ خیر خواہی بھی ایک اہم فریضہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیدہ و دانستہ خود کوئی ایسا عمل نہ کرے جو مملکت کے مفاد کے خلاف ہو، نہ ہی کسی دوسرے فرد کو ایسا عمل کرنے دے جو مملکت یا ملت اسلامیہ کے خلاف جاتا ہو، اگر مملکت کی جانب سے کوئی ذمہ داری سپرد کی جائے تو اسے پوری دیانت داری اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دے۔ رشوت ستانی، بے ایمانی، ناجائز اقربا پروری، ظلم، کام چوری، اسراف، دھوکہ و بد دیانتی وغیرہ ان برائیوں کا نہ خود ارتکاب کرے نہ دوسرے کو کرنے دے۔

اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (توبہ، ۹:۹۱)
رسول اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے خیر خواہ ہوں

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ دین خیر خواہی کا نام ہے۔

الدین النصیحة قلنا لمن؟ قال لله ولکتابه ورسوله ولائمة المسلمین وعامتهم[۲۲]
آپؐ نے فرمایا کہ دین خیر خواہی کا نام ہے، ہم نے پوچھا، اے اللہ کے رسول کس کے ساتھ؟ آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ کے ساتھ اس کی کتاب اور اس کے رسول اور مسلمان قائدین اور مسلمانوں کے ساتھ۔

ایک اچھے اور صالح معاشرہ کی علامت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ لوگ اپنی قیادت سے محبت کریں اور قائدین کو اپنے عوام سے محبت ہو، عوام اپنے حکمرانوں کے لئے دعاء خیر کریں اور حکام اپنے عوام کے لئے دعاء خیر کریں[۲۳]۔ رسول اللہ نے تو خیر خواہی پر لوگوں سے بیعت بھی لی ہے۔ ایسے معاشرہ میں قیادت اور عوام میں باہمی محبت اخلاص اور خیر خواہی کا جذبہ پوری طرح کار فرما ہوتا ہے۔

عن جریر بن عبد الله قال، بایعت رسول الله صلی الله علیه وسلم علی اقامة الصلوة وایتاء الزکوة والنصح لکل مسلم (متفق علیه)[۲۴]
میں نے نماز قائم کرنے زکوٰۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی پر رسول اللہ کی بیعت کی۔

خلفاء راشدین عوام کا یہ فرض انہیں یاد دلاتے رہتے تھے' اور جب کبھی کسی نے خلیفہ کو خیر خواہانہ نصیحت کی تو انہوں نے اسے غور سے سنا۔

تعاون: اسلامی مملکت کا نظم و نسق دراصل امت مسلمہ کا اجتماعی نظم ہے جس میں وہ اپنے مقاصد کے حصول اور اپنے مشن کی تکمیل کے لئے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر باہمی تعاون موجود نہ ہو تو یہ نظم اور اجتماعیت قائم نہیں رہ سکتا اور نہ امت اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ٹھیک ٹھیک کام کر سکتی ہے اس لئے عوام کے تعاون کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى' وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ' ۵:۲)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو' اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

عوام کا تعاون دینی امور میں بھی ہوگا اور سیاسی و اجتماعی معاملات میں بھی' جس طرح ذوالقرنین نے یاجوج وماجوج کے فتنہ کا سدباب کرنے کے لئے لوگوں سے تعاون کی اپیل کی تھی۔

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا (کھف' ۱۸:۹۵)

ذوالقرنین نے کہا کہ جو قوت اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہے اس میں بہتری ہے لہٰذا میری مدد کرو اپنی قوت و صلاحیت سے میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دوں گا۔

حکومت کے ساتھ تعاون کے بے شمار طریقے ہو سکتے ہیں۔ اپنی تمام فکری' جسمانی اور عملی صلاحیتوں کے ساتھ تعاون ضروری ہے۔

جان کی قربانی: تعاون کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ جب امت اسلامیہ اور مملکت کے تحفظ کا مسئلہ درپیش ہو تو ہر صاحب صلاحیت فرد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار ہو اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے مستعد رہے۔ حکومت جب جہاد کے لئے بلائے تو حکومت کے ساتھ تعاون کرے اور اس قربانی کے لئے ہر وقت تیار رہے۔

مال کی قربانی: مالی قربانی میں بھی تعاون ہر شہری کا فرض ہے۔ جہاں تک زکوٰۃ اور صدقات کا تعلق ہے وہ تو ادا کرنا ہی ہوں گے لیکن ان کے علاوہ بھی ضرورت پڑ جائے تو مالی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ جہاد اور مملکت کے تحفظ کے لئے مالی قربانی کی ضرورت پڑے تو ہر شہری کو پوری خوش دلی کے ساتھ اس قربانی کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (بقرہ، ۲:۲۱۹)

اور وہ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کس حد تک خرچ کریں، آپ بتا دیجئے کہ جو کچھ ان کی ضرورت سے بچ رہے وہ سب کچھ خرچ کر دیں۔

اسلامی مملکت اور غیر مسلم رعایا

اسلامی مملکت میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی رہ سکتے ہیں، وہ بھی اس مملکت کے شہری ہیں، ان کے حقوق کا تحفظ بھی اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے، سیاسیات پر قدیم اسلامی ادب میں غیر مسلم رعایا کے لئے دو اصطلاحات ملتی ہیں، ایک معاہد یا اہل الصلح، یہ وہ لوگ ہیں جو کسی معاہدہ یا صلح کے نتیجہ میں مملکت اسلامیہ کے شہری قرار پائیں گے۔ اس قسم کے غیر مسلم شہریوں کو وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہوں گی جو معاہدے میں طے پا چکی ہیں۔ مملکت یا حکومت ان میں کوئی کوتاہی نہیں کر سکتی، ان کے طے شدہ حقوق کے لئے حکومت اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی جواب دہ ہے اور لوگوں کے سامنے بھی جواب دہ ہے۔ اس قسم کے معاہدات اسلامی تاریخ میں بہت سے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی معاہدے کئے اور خلفاء راشدین نے بھی، ان معاہدات کے نتیجہ میں وہ لوگ اسلامی مملکت کے شہری قرار پائے، ان میں اہل فدک، اہل نجران، بنی تغلب کے عیسائی وغیرہ کے ساتھ معاہدات، نظائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسرے غیر مسلم شہری اہل الذمہ کہلاتے ہیں۔ یہ وہ مفتوحین ہیں جو جنگ کے نتیجہ میں مملکت اسلامیہ کے شہری بنے ہیں۔ انہیں اہل الذمہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی مملکت پر عائد ہوتی ہے مفتوحین جونہی اسلامی مملکت کا عائد کردہ ٹیکس یعنی جزیہ دینا قبول کر لیتے ہیں اسی وقت سے ان کے مکمل تحفظ کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہو جاتی ہے، اہل الذمہ کے یہ حقوق اللہ اور رسول کی ضمانت پر دیئے جاتے ہیں لہٰذا کوئی حکومت ان میں کوتاہی نہیں کر سکتی۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب کبھی کسی حکومت نے ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، فقہاء اور اہل علم نے اہل الذمہ کے حقوق کی تائید کی اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ ان کے حقوق پوری طرح ادا کرتی رہے۔ شریعت نے جو حقوق ان کے لئے طے کر دیئے ہیں ان میں کمی کا حق حکومت کو بھی نہیں ہے۔

اسلامی مملکت اہل الذمہ کو جو جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتی ہے اس کے عوض ایک ٹیکس وصول کرتی ہے جو صرف ان مردوں پر لگایا جاتا ہے، جو جوان، صحت مند اور صاحب روزگار ہوں۔ خواتین، بچے، اپاہج، بوڑھے، راہب، عبادت گاہوں کے خدام اور وہ لوگ جو جنگ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ جزیہ کی ادائیگی پر جو حقوق اہل الذمہ کو حاصل ہوتے ہیں ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

جان کی حفاظت : اہل الذمہ کی جان اسی طرح محفوظ ہے جس طرح مسلمان کی جان' اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے گا تو اس کے بدلے مسلمان سے قصاص لیا جائے گا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے ذمی کو' جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ذمہ لیا گیا ہے' قتل کیا اس نے اللہ تعالیٰ کے ذمہ کو توڑا' ایسا فرد جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا' حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی دوری سے سونگھی جا سکتی ہے[۲۵]۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی۔

انا احق من وفی بذمة

میں اس کا زیادہ حق دار ہوں جس نے اپنا حق ذمہ پورا کیا۔

یعنی جس ذمی نے اپنا حق ذمہ پورا کیا ہے میں اس کے تمام حقوق کے تحفظ کے لئے زیادہ حق دار ہوں۔ عہد خلافت راشدہ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک مسلمان کو ذمی کے قتل پر سزائے موت دی گئی۔

مال کی حفاظت : جس طرح ذمی کی جان محفوظ ہے اسی طرح اس کا مال بھی محفوظ ہے۔ مال کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اسلامی مملکت پر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جابیہ میں ایک ذمی کے انگوروں کے باغ کی قیمت ادا کر کے اس زیادتی کی تلافی کی تھی جو بعض لوگوں نے اس کے باغ کے ساتھ کی تھی[۲۶]۔

زرعی زمین کا تحفظ : اہل ذمہ اگرچہ زمینوں کے حقیقی مالک نہیں رہتے لیکن انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل بھی نہیں کیا جاتا' زمینوں پر ان کا قبضہ برقرار رہتا ہے' اور انہی کی نسل میں یہ قبضہ وراثتاً" منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اہل ذمہ ان زمینوں پر آپس میں لین دین' ہبہ اور بیع کے معاملات بھی کر سکتے ہیں۔ حکومت ان زمینوں پر صرف ان کی پیداوار کے لحاظ سے ایک مناسب ٹیکس وصول کرتی ہے جو فقہاء کی اصطلاح میں خراج کہلاتا ہے۔

فوج داری قانون : فوجداری قانون میں مسلم اور اہل الذمہ یکساں ہیں' کوئی مسلمان کے گھر چوری کرے تو اس پر حد جاری ہوتی ہے۔ اسی طرح حد اس وقت بھی جاری ہوگی جب کوئی کسی ذمی کا مال چرائے گا۔ ذمی کی عزت و آبرو بھی محفوظ ہے۔ اس پر تہمت لگانے والے کو سزا ملے گی۔ البتہ شراب نوشی کے معاملہ میں ذمیوں کے لئے سزا نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ اپنے گھروں میں یا اپنے علاقوں میں لا کر شراب نوشی کریں اور اس کے اثرات باہر نہ لائیں۔

دیوانی قانون : دیوانی قانون بھی مسلمانوں اور اہل ذمہ کے لئے یکساں ہے لہٰذا دیوانی قانون کی رو سے جتنی پابندیاں مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں وہی سب ذمیوں پر بھی عائد ہوں گی البتہ اہل ذمہ اپنے مخصوص علاقوں میں خود آپس میں شراب کا کاروبار کر سکتے ہیں یا شراب کشید کر سکتے ہیں' ہاں اگر وہ اس کے اثرات اپنے علاقوں میں محدود نہ رکھ سکیں اور ان کی وجہ سے مسلم معاشرہ یا مسلمانوں کے علاقے بھی متاثر ہونے لگیں تو حکومت ایسے اقدامات کر سکتی

ہے جو اس کے اثرات کو پھیلنے سے روک سکے۔

مذہبی آزادی: مذہب کے بارے میں اہل ذمہ کو پوری آزادی ہوگی' ان کی عبادت گاہیں محفوظ ہوں گی۔ ان کے مذہبی قانون میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ انہیں اس کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں اپنے مذہب کے مطابق عمل کریں۔ وہ چاہیں تو اپنے ذاتی معاملات کو اپنی مذہبی عدالت میں بھی لے جا سکتے ہیں۔ حکومت ان کے پرسنل لا میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔

روزگار اور معاش کا ذمہ: اگر کوئی ذمی اپنی روزی کمانے سے عاجز ہے تو حکومت اس کے معاش کی ذمہ دار ہے' بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کیا جائے گا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو فرمایا' ہم نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا کہ جب تم جوان تھے اور کماتے تھے تو ہم نے تم سے جزیہ وصول کیا اور اب جب تم کمانے کے قابل نہیں رہے تو تمہیں تمہاری حالت پر چھوڑ دیا' ایسا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا[۲۷]۔

اہل الذمہ کا دفاع: اہل ذمہ کا دفاع اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے' اگر دشمن نے اہل ذمہ کے علاقہ پر حملہ کیا تو اہل ذمہ کی مدافعت کے لئے اسلامی مملکت اپنی افواج کو بھیجے گی۔ اگر ان کی خاطر جنگ کی نوبت آئے تو جنگ سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی ذمی دشمن کی قید میں چلا جائے اور اسے فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو بیت المال سے فدیہ ادا کرا کے چھڑایا جائے گا[۲۸]۔

جزیہ اور خراج کی وصولی کے لئے ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔ جو مناسب اور باعزت ہو یعنی اہل الذمہ پر بلا وجہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔

لا یکلفوا فوق طاقتہم [۲۸]

ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بار نہ ڈالا جائے گا

ان سے ٹیکس وصول کرنے والے ایسے لوگ مقرر کئے جائیں گے جو دیانتدار ہوں اور جزیہ و خراج کے احکام سے واقف ہوں۔ بہرحال حکومت اس بات کی پوری طرح نگرانی کرے گی کہ عمال حکومت یا مسلم رعایا میں سے کوئی بھی اہل ذمہ کے ساتھ زیادتی کا مرتکب نہ ہو۔ اگر حکومت اہل الذمہ کے تحفظ میں ناکام رہی ہو تو اسے ان سے جزیہ و خراج لینے کا کوئی حق نہیں ہے' اگر وہ جزیہ یا خراج وصول کر چکی تھی تو اسے ان کی رقم واپس کرنا ہو گی۔

حصہ سوم

اسلامی ریاست یا لادینی ریاست

یورپ میں سترھویں صدی سے انیسویں صدی تک کا دور تغیرات کا دور ہے' اس عرصہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور نئے فلسفیانہ تصورات نے مغربی اقوام کو ایک نئی سوچ اور فکر سے ہم آہنگ کیا۔ یہ سوچ بنیادی طور پر اس فکر سے مختلف تھی جس کی بنیاد مذہب پر چلی آ رہی تھی۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں بہت سے مغربی مفکرین نے یہ پیش گوئیاں کرنی شروع کر دی تھیں کہ سائنس اور مذہب ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ترقی کا ایسا دور ہے کہ جس میں انسانی معاشرہ تیزی سے نئے دور میں داخل ہو رہا ہے' یہ علوم و فنون کا دور ہے اور ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے اور جانچنے کا زمانہ ہے۔ مذہب اور مذہب میں مابعد الطبیعاتی مسائل ترقی کی تیز رفتاری میں رکاوٹ ہیں لہٰذا مذہب کو اس راہ میں رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے' دنیا کے معاملات' انسانوں کے باہمی تعلقات' سیاست' معیشت اور اقوام کے باہمی امور میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے' اس لئے کہ مذہب' بقول مغربی مفکرین' ان مسائل میں کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یا اور مذہب سے بیزاری اس حد تک ہوئی کہ اس قسم کی تحریریں آنے لگیں کہ "خدا کا وجود ختم ہو گیا" "آزاد دنیا۔ نہ کوئی خدا نہ کوئی مذہب"[۲۹]۔ اس قسم کے تصورات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائیت جس پر رومی و یونانی افکار کے اثرات تھے اور جس میں یہودی تصورات کی آمیزش بھی تھی' اہل مغرب کی رہنمائی کرنے سے قاصر رہی۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں یہ تصور مقبول ہوتا چلا گیا کہ مذہب اور مذہبی روایات لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے اور انسانوں کے باہمی مسائل کے حل میں اس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ یہ گویا انسان کی قدیم تاریخ سے ہٹ کر ایک نئے تصور کی دریافت تھی کہ دنیا انسان کے ہاتھوں میں ہے' وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے اس پر کوئی قدغن نہیں' وہ کسی اور قوت کے سامنے جواب دہ نہیں' وہ مطلقاً" آزاد ہے۔ تقدیر' آخرت اور وحی وغیرہ سب قدیم توہمات ہیں۔

ان تصورات کے ساتھ اہل مغرب کا سیکولرازم کی جانب سفر شروع ہوا' عیسائیت میں پروٹیسٹنٹ خاص طور پر نہ صرف مذہب کی عقلی بنیادوں پر نئی تعبیر کے حامی تھے بلکہ مذہب کو صرف کلیسا کی رسوم تک محدود کرنے کے بھی حامی تھے۔ وہ عیسائی جو لادینی نظام کی مخالفت کر رہے تھے ان کے پاس نہ دلیل کی قوت تھی اور نہ ہی مذہب کی حدود میں رہتے ہوئے ایسا متبادل نظام تھا جو لوگوں کو مطمئن کر سکتا۔ عیسائیت میں سب سے بڑی کمزوری تثلیث کا پیچیدہ نظریہ تھا جس کی کوئی عقلی تعبیر پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ عیسائیت کی ساری بنیاد چونکہ اس غیر عقلی تصور پر تھی اس لئے یہ خیال مضبوط ہوتا چلا گیا کہ مذہب معاملات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی اجازت نہیں دیتا اور پھر اسی بنا پر یہ تصور قائم ہو گیا کہ یہ مذہب زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ کلیسا کی

شکست نے لادینی نظام کی راہ ہموار کی۔

لفظ سیکولر (Secular) لاطینی لفظ (Saeculum) سے ماخوذ ہے اس کے دو مفہوم ہیں۔ وقت اور جگہ، وقت سے مراد موجودہ دور ہے اور جگہ سے مراد یہ دنیا ہے۔ گویا یہ لفظ دنیا کے موجودہ امور کی طرف توجہ دلاتا ہے، نہ ماضی کا ورثہ کوئی اہمیت رکھتا ہے، نہ ہی موت کے بعد کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ اصطلاحاً" اس سے مراد ایسا نظام ہے جو انسان کو اولاً" مذہب اور پھر تمام غیبی اور مابعدالطبیعاتی تصورات کی گرفت سے آزاد کرا سکے[۳۰]۔

سیکولرازم کا ایک لازمی مظہر یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں جنہیں مذہب کی بنا پر احترام و تقدس حاصل تھا ان سے اس احترام و تقدس کی نفی کر کے انہیں ان عام چیزوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے جن کے ساتھ اس قسم کا کوئی جذبہ وابستہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قدیم تہذیب و تمدن اور روایات سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی اقدار بھی مٹنے لگتی ہیں جو مذہب کی بنیاد پر معاشرہ میں رائج ہوتی ہیں۔

موجودہ دور میں (Secularization) کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ سیاسی و انتظامی اختیارات مذہبی اداروں سے لے کر لادینی اداروں کے حوالے کر دیئے جائیں، اس عمل کے دو پہلو ہیں موضوعی اور معروضی۔ موضوعی پہلو یہ ہے کہ مذہبی افکار، تصورات اور احساسات بطور ایک خود مختار قوت کے بتدریج ختم ہو جائیں یا پھر کچھ مافوق الفطرت اشیاء کی عبادت تک محدود ہو کر رہ جائیں۔ اور یوں لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی، آپس کے معاملات اور روز مرہ زندگی کے امور مذہب کے حوالے کے بغیر انجام دینے لگیں۔

معروضی پہلو یہ ہے کہ اس عمل کے ذریعے مذہبی ادارے اور رسوم و رواج کا تعلق عوامی زندگی سے ختم ہو جائے، مثلاً تعلیم، قانون سازی، نظم و نسق اور حکومت کے انتظامی ادارے مذہب کے اثرات سے بالکل الگ ہو جائیں[۳۱]۔

اسلام اس اعتبار سے دیگر مذاہب سے مختلف ہے کہ یہ صرف پوجا پاٹ یا چند مذہبی رسوم کی ادائیگی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ہمہ گیر اور جامع نظام زندگی ہے جو ہر شعبہ حیات کے بارے میں ہدایات دیتا ہے۔ شریعت کی رہنمائی بچہ کی پیدائش سے قبل شروع ہو جاتی ہے اور موت کے بعد تک جاری رہتی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں عالم الغیب اور عالم الشہادہ ایسے عالم نہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ اخروی زندگی میں فلاح و سعادت کا دارومدار دنیوی زندگی اور یہاں کے اعمال پر موقوف ہے۔ دنیا دارالعمل بھی ہے اور دارالامتحان بھی، اسی لئے حیات انسانی کے تمام پہلوؤں سے متعلق ہدایات دی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ کونسا عمل صحیح ہے اور کونسا غلط، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز، حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ پھر اعمال کو انہی اصولوں پر پرکھا جاتا ہے، نیز شریعت انسان کی حیثیت کا تعین کر کے اس کی ذمہ داریوں کا تعین بھی کرتی ہے کہ بحیثیت عبد اس کا کیا مقام ہے اور کیا فرائض ہیں اور

بحیثیت خلیفہ کن ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے' انفرادی واجبات کیا ہیں اور اجتماعی ذمہ داریاں کونسی ہیں۔ عبادات کس طرح ادا کی جائیں گی اور انسانوں کے باہمی معاملات' معاشی ہوں یا معاشرتی' سیاسی ہوں یا قانونی' ان کو طے کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا' ان سب باتوں کے بارے میں تفصیلی یا اصولی ہدایات موجود ہیں۔ کوتاہی کی صورت میں صرف یہی نہیں کہ آخرت میں گرفت یا سزا ہوگی بلکہ دنیا میں بھی محاسبہ اور سزا کا تصور موجود ہے۔

اس کے برعکس عیسائیت کا پیغام محدود تھا' اس نے صرف روح کو مخاطب بنایا اور کچھ اخلاقیات کی تعلیم دی اس کے پاس دنیوی زندگی کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ اس خلا کو پر کرنے کا عمل رومی سلطنت کی نگرانی میں اس وقت شروع ہوا جب عیسائیت نے اپنے اصل مرکز یروشلم کو چھوڑ کر روم کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ اور بقول پروفیسر نقیب العطاس مرکز کی یہ تبدیلی ہی نقطہ آغاز تھا پہلے مغربیت (Westemization) کی طرف اور پھر سیکولرازم کی طرف[۳۲]۔ اس لیے کہ رومی سلطنت کی نگرانی میں جو قانونی ارتقاء ہوا وہ وحی کی ہدایت سے محروم تھا اسی لئے اس میں لادینی اثرات غالب ہوتے گئے۔ عیسائیت اپنی اس خامی کی وجہ سے ان مسائل کا حل پیش نہ کر سکی جو صنعتی انقلاب اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوئے' اس ناکامی کو مغربی مفکرین نے مذہب کی ناکامی تصور کیا اور مذہب کو اجتماعی زندگی سے الگ کر دیا۔

عیسائیت کے برعکس اسلام میں عقل اور نفس کو بھی اسی طرح خطاب کیا گیا ہے جس طرح قلب و روح کو کیا گیا۔ اسلامی نظام زندگی کے ارتقاء میں جس طرح قلب و روح کا کردار رہا ہے اسی طرح عقل و فکر اور ذہانت کا بھی اہم رول رہا ہے۔ تفقہ' تفکر' تدبر' تعقل' تعلیم الکتاب' اور تعلیم الحکمت ایسی اصطلاحات ہیں جن سے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے والا ہر فرد واقف ہے۔ واقعاتی شواہد ہوں یا تاریخی واقعات قرآن کریم ان سے استنباط و استدلال کی دعوت دیتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شریعت نے اجتہاد کا ایسا اصول دیا ہے جس کی بنیاد پر ہر دور اور ہر زمانہ کے مسائل کو شریعت کی حدود میں رہ کر طے کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے ہر دور اور ہر زمانہ کے سیاسی' انتظامی' معاشی' معاشرتی اور قانونی امور میں شریعت کا نقطہ نگاہ دین کے عطا کردہ رہنما اصولوں کی روشنی میں پیش کیا اور عامتہ المسلمین میں وہی رائے زیادہ مقبول ہوئی جو شریعت کی روح سے زیادہ قریب تھی۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں یہ تقسیم ممکن ہی نہیں کہ حقوق اللہ کی نگرانی کا کوئی پیمانہ ہو اور حقوق العباد کی نگرانی کا کوئی اور' یا دینی امور صرف مسجد و محراب تک محدود ہوں اور وحی کی رہنمائی بھی عبادت خاصہ تک محدود ہو جائے اور باقی معاملات لادینی بنیادوں پر طے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے بعد خلفاء راشدین نے ان تمام معاملات میں ایک وحدت' توازن اور اعتدال رکھا ہے اور یہ سب کچھ وحی الٰہی کے تحت ہوا' لہٰذا اب اس قسم کے سوال کی کوئی گنجائش نہیں کہ امت کے بعض امور میں دین کی رہنمائی کافی ہے اور دیگر تمام امور میں دین کی

رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ یا یہ کہ دنیا کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی امور لادینی بنیادوں پر طے کئے جائیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (بقرہ ۲:۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دین کو مکمل کر دیا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے، اس کی ہدایت دائمی ہے اور اس کی تعلیمات ہر دور کے لئے ہیں۔ اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے احکام واضح طور پر بیان ہوئے ہیں اور یہ سب دین کا حصہ ہیں۔ ان پر ہر دور میں عمل ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، لہٰذا سیکولرازم یا لادینی نظام کا کوئی تصور اسلام میں پیدا نہیں ہوتا، نہ ایسا کوئی تصور امت اسلامیہ کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

مزید مطالعہ کے لئے

۱۔ خطبات بہاولپور، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، اسلام آباد

۲۔ اسلامی ریاست، سید ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور

۳۔ اسلامی ریاست، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، اسلام آباد

۴۔ اسلامی ریاست، مولانا گوہر رحمٰن، مردان

۵۔ اسلامی ریاست، امین احسن اصلاحی، لاہور

۶۔ اسلام کا سیاسی نظام، محمد اسحاق سندیلوی، لاہور

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، (تحقیق خالد ہراس) مکتبہ الجمہوریہ قاہرہ) ج ۴ ص ۴۵۷ : الطبری، (تاریخ الرسل والملوک دار المعارف قاہرہ، ۱۹۶۱ء) ج ۳ ص ۲۱۰

۲۔ ناصف، شیخ منصور علی، التاج الجامع الاصول احادیث الرسول، ج ۳ ص ۴۳

۳۔ ابن الاعثم الکوفی، کتاب الفتوح، ج ۱، ص ۳۰۲

۴۔ ابن ہشام، السیرہ النبویہ، ج ۴ ص ۴۵۷ : الطبری، تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۱۰، ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۵، ص ۲۴۸

۵۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص ۵

۶۔ ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم ج ۴ ص ۱۸ ابو حیان، البحر المحیط، ج ۷، ص ۵۲۲

۷۔ البخاری، الجامع الصحیح، ج ۳، جز ۹، ص ۸۹

۸۔ ابو عبید، کتاب الاموال، ۱۵۹ ص

۹۔ تاریخ ابن کثیر، نفیس اکیڈیمی، کراچی، حصہ چہارم، ۱۹۸۷ء، ص ۵۱۰

۱۰۔ باقلانی ابوبکر، التمہید، ص ۱۸۴ : الکاسانی علاء الدین بدائع الصنائع، ج ۷، ص ۱۶

۱۱۔ الدارمی، السنن، ج ۱، ص ۵۸

۱۲۔ مدینہ منورہ کے مشہور فقہاء یہ تھے (۱) خارجہ بن زید (۲) قاسم بن محمد (۳) عروہ بن زبیر (۴) سلمان بن یسار (۵) عبیداللہ بن عبداللہ (۶) سعید بن المسیب (۷) سالم بن عبداللہ

۱۳۔ الطبری، التفسیر الکبیر (المطبعہ المیمنہ، قاہرہ، ج ۵، ص ۸۵، ۸۶، ابن تیمیہ، السیاستہ الشرعیہ (دارالارقم کویت) ص ۱۳، ۱۷، ۱۸

۱۴۔ ابو عبید، کتاب الاموال (دارالفکر، القاہرہ، ۱۹۷۵ء) ص ۳۵۱۔ ۳۵۲ حضرت عمر عہد ابوبکر میں قاضی تھے۔ یہ فیصلہ انہوں نے بحیثیت قاضی کیا تھا۔ دیکھئے وکیع اخبار القضاء، ج ۱، ص ۱۰۴

۱۵۔ سندیلوی، محمد اسحاق، اسلام کا سیاسی نظام (اسلامک بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۸، ۲۴۹ حوالہ فتاویٰ عالمگیری۔ کتاب ادب القاضی باب خامس)

۱۶۔ فاروقی، محمد یوسف "اجماع کا ارتقاء! خلفاء راشدین کی عملی زندگی اور متقدمین فقہاء کے افکار کی روشنی میں" The American Journal of Islamic Social Sciences ج ۷، نمبر ۲، ص ۱۷۳۔ ۱۸۷

۱۷۔ ماوردی، الاحکام السلطانیہ، تیسرا باب : ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ، باب تقلید الامارہ : السید عبدالمالک ص ۲۰۳۔

۵۶۸ "Social Ethics of Islamic" نیویارک ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۳۔ ۱۴۶

۱۸۔ یوسف حامد العالم، المقاصد العامہ للشریعہ الاسلامیہ، (المعہد العالمی للفکر الاسلامی، امریکہ ۱۹۹۱ء) ص ۲۰۳۔ ۵۶۸

۱۹۔ تفصیلات کے لئے دیکھیے، اصلاحی، امین احسن۔ اسلامی ریاست (انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۷۷ء) شہریت کے حقوق و فرائض، ص ۹۸۔ ۱۵۵ مودودی، اسلامی ریاست (اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۵۴۹۔ ۵۷۱

۲۰۔ اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست ص ۱۵۸

۲۱۔ لادوست، ہنری، نظریات ابن تیمیہ فی السیاستہ والاجتماع (محمد عبدالعظیم) دار الانصار، القاہرہ، ۱۹۷۹ء ص ۲۳۷

۲۲۔ نودی، ابو زکریا یحییٰ بن شرف، ریاض الصالحین (مصطفیٰ الباب الحلی، القاہرہ، ۱۹۳۸ء) ص ۱۰۷

۲۳۔ مسلم، الجامع الصحیح (نور محمد، کراچی، ۱۹۵۲ء) ج ۲، ص ۱۲۹

۲۴۔ نبوی، ریاض الصالحین، ص ۱۰۷

۲۵۔ اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست، ص ۲۲۲

۲۶۔ اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست، ص ۲۲۴۔ ۲۲۵

۲۷۔ اصلاحی، امین احسن، اسلامی ریاست، ص ۲۲۱

۲۸۔ ابو عبید، کتاب الاموال، دار الفکر، القاہرہ، ۱۹۸۱ء، ص ۱۲۷۔ ۱۲۸

۲۹۔ دیورینٹ (W. Durant) The Story of Philosophy (نیویارک ۱۹۲۶ء) باب نہم

۳۰۔ عطاس، محمد نقیب، Islam and Secularism، ص ۱۷

۳۱۔ روجر اسکروٹن A Dictionary of Political Thought (میکملن پریس، لندن، ۱۹۸۲ء) ص ۴۲۰

۳۲۔ عطاس، محمد نقیب Islam and Secularism ص ۲۹

مصادر و مراجع

۱۔ ابن تیمیہ / ہنری لادوست — نظریات ابن تیمیہ فی السیاسہ والاجتماع، (دار الانصار القاہرہ ۱۹۷۹ء) (عربی ترجمہ محمد عبدالعظیم)

۲۔ ابن تیمیہ — السیاستہ الشرعیہ — (دار الارقم، کویت ۱۹۸۶ء)

۳۔ ابن جماعۃ، بدرالدین — تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام — تحقیق کوفلر Islamices H، ۱۹۳۸ء ۳۵، ۳۴

۴۔ ابن قیم — اعلام الموقعین — (دار الفکر، بیروت)

۵۔ ابن کثیر، ابو الفداء — البدایہ والنہایہ

۶۔ ابن کثیر،	تفسیر القرآن العظیم	(عیسیٰ البابی، القاہرہ ۱۳۴۲ھ)
۷۔ ابن ہشام،	السیرۃ النبویہ	تحقیق خالد ہراس (مکتبہ الجمہوریہ قاہرہ)
۸۔ ابو عبید	کتاب الاموال	(دار الفکر، القاہرہ ۱۹۸۱ء)
۹۔ اصلاحی، امین احسن	اسلامی ریاست	(انجمن خدام القرآن، لاہور ۱۹۷۷ء)
۱۰۔ الباقلانی، ابوبکر	التمہید	
۱۱۔ تفتازانی، سعد الدین	شرح المقاصد	(لاہور ۱۹۸۱ء)
۱۲۔ الجوینی، امام الحرمین،	غیاث الامم	(الاسکندریہ ۱۹۸۹ء)
۱۳۔ حامد العالم، یوسف	المقاصد العامہ للشریعہ الاسلامیہ	(المعہد العالمی للفکر الاسلامی U.S ۱۹۹۱ء)
۱۴۔ حلمی، مصطفیٰ	نظام الخلافہ فی الفکر اسلامی	(دار الدعوہ، الاسکندریہ ۱۹۷۷ء)
۱۵۔ الدارمی، ابو محمد عبداللہ	السنن	(دار الکتب العلمیہ، بیروت، تاریخ ندارد)
۱۶۔ ڈیورینٹ (W. Durant)	The Story of Philsophy	(نیویارک ۱۹۴۶ء)
۱۷۔ روجر اسکروئن	A Dictionary of Poltical Thought	(میکملن پریس، لندن، ۱۹۸۱ء)
۱۸۔ الریس، محمد ضیاء الدین	النظریات السیاسیہ الاسلامیہ	(دار التراث، القاہرہ ۱۹۷۹ء)
۱۹۔ سندیلوی، محمد اسحاق	اسلام کا سیاسی نظام	(اسلامک بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۱۹۸۹ء)
۲۰۔ السید، عبدالملک	Social Ethics of Islam	(ویٹنگ پریس نیویارک ۱۹۸۲ء)
۲۱۔ الطبری، ابن جریر،	تاریخ الرسل و الملوک	(دار المعارف، قاہرہ ۱۹۶۱ء)
۲۲۔ الطبری، ابن جریر،	التفسیر الکبیر	(المطبعہ المیمنہ، قاہرہ)
۲۳۔ العطاس، سید محمد نقیب	Islam and Secularism	(ISTAC کوالالمپور ۱۹۹۳ء)
۲۴۔ غازی، محمود احمد	Studies in the Political and Constitutional thought of Islam	(نیشنل بک ہاؤس، لاہور ۱۹۹۳ء)
۲۵۔ غازی، محمود احمد	ادب القاضی	(ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۸۳ء)
۲۶۔ الکاسانی، علاء الدین	بدائع الصنائع	(ایم ایچ سعید کمپنی ۱۴۰۰ھ)
۲۷۔ الکوفی، ابن الاعثم	کتاب الفتوح	(دائرہ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۸ء)
۲۸۔ لادوست، ہنری	نظریات ابن تیمیہ فی السیاستہ اوالاجتماع	(دار الانصار، قاہرہ ۱۹۹۷ء)

عربی ترجمہ محمد عبدالعظیم

۲۹۔ الماوردی، ابوالحسن علی بن حبیب الاحکام السلطانیہ (دارالفکر القاہرہ ۱۹۶۶ء)

۳۰۔ محمد رافت عثمان ریاسہ الدولہ فی الفقہ الاسلامی دارالکتاب الجامعی، القاہرہ

۳۱۔ المسلم، ابوالحسین مسلم بن الحجاج الجامع الصحیح (نور محمد کراچی ۱۹۵۶ء)

۳۲۔ مودودی، ابو الاعلیٰ، سید اسلامی ریاست (اسلامک پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۷۴ء)

۳۳۔ ناصف، منصور علی التاج الجامع لاصول فی احادیث الرسول

۳۴۔ النووی، یحییٰ بن شرف ریاض الصالحین (مصطفیٰ البابی الحلی، القاہرہ ۱۹۳۸ء)

''مطالعہ اسلامی قانون'' کے مطبوعہ مضامین

۱۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ اول۔قرآن

۲۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ دوم۔سنت

۳۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ سوم۔اجماع

۴۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ چہارم۔قیاس

۵۔ اجتہاد کی تعریف

۶۔ اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

۷۔ دینی مسائل میں اختلاف، اسباب اور ان کا حل

۸۔ اسلام کا قانون نکاح وطلاق

۹۔ اسلام کا قانون وراثت ووصیت

۱۰۔ اسلام میں عورت کی استثنائی حیثیت اور اس کی وجوہ

۱۱۔ اسلام کا تصور ملکیت ومال

۱۲۔ اسلام کا تصور معاہدہ

۱۳۔ اسلام میں شراکتی کاروبار کا تصور

۱۴۔ مزارعت اور مساقات

۱۵۔ اسلام کا نظام محاصل

۱۶۔ اسلام کا نظام مصارف

۱۷۔ اسلام میں عدل وقضاء کا تصور

۱۸۔ اسلام کا نظام احتساب

۱۹۔ اسلامی نظام عدل وقضاء میں شہادت کا تصور

۲۰۔ اسلام کا تصور جرم وسزا

۲۱۔ اسلام کا فوجداری قانون

۲۲۔ اسلام کا دستوری قانون

۲۳۔ اسلام کا قانون بین الممالک

۲۴۔ اسلام میں ربا کی حرمت اور بلاسود سرمایہ کاری